

پہلی دفعہ نہیں تھا مگر سب یوں اشتیاق سے
ہمدن گوش میں جیسے ہملا بارن رہی ہوں۔ جب بھی
خانمان میں کسی وجہ سے سب اکٹھا ہوتے، یہ ان
سب کا پسندیدہ موضوع ہوتا۔ خاص کر جوان نسل کو
اپنے تپا اور باموں کے عشق کی ادھوری داستان میں
بہت دلچسپی تھی۔ اس وقت تو فوزیہ آنٹی کے گرد صرف
لڑکیاں تھیں مگر اکثر موقعوں پر ان کے ساتھ لڑکے بھی
انہیں گھیر کر بیٹھے ہوتے تھے۔ نعماء اور احسن خود ہی
ایسے موقعوں پر ان کے لیے میدان کھلا چھوڑ کر ادھر
ادھر ہو جاتے تھے۔
ان سب کے دل میں رقیہ اور تصدق کے لیے
جو عقیدت تھی اس کا سہرا فوزیہ آنٹی جیسی خالوں،
پھوپھوؤں اور کزنز کے سر تھا، جنہوں نے تصدق اور
رقیہ کی کہانی اس دل پذیر اور دل سوز اعجاز میں انہیں
سنائی تھی کہ وہ سب گردیدہ ہو گئے تھے۔ خاص طور پر
فوزیہ آنٹی جو رشتے میں ان سب کی خالہ اور پھوپھی تھیں

”اس سے پہلے ایسا قصہ کہانوں میں سنا تھا
اور گستاخ سب کہانیوں اور قصوں میں ہی ہوتا ہوگا
لیکن یہ تو آنکھوں دیکھی ہے، اب بھی دیکھ رہے ہیں،
آنکھوں کے سامنے ہی اتنے برسوں بعد بھی اب تک
یہ کہانی جاری ہے جو کئی سالی بات ہے نہ کوئی
اساطیری حکایت مگر اس وقت ہمیں پتا ہی نہ تھا کہ یہ کیا
حاصل ہے، ہم کس داستان کے گواہ بن رہے ہیں۔
ایسی داستان جو مثال بن جائے گی، خاموش
جنیوں کی قربانوں کی، ان کے وعدوں کی، وفا کی،
بیڑوں کے بے رحم فیصلوں اور بے کار ضد کی۔“
فوزیہ آنٹی ذرا دیر سانس لینے کو رکھی تھیں اور اس
نے بھی بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ اس وقت اسے
اندازہ ہوتا کہ گیت کھول کر احسن اندر آیا ہے تو وہ کسی
بہانے فوزیہ آنٹی کی داستان کوئی رکاوٹ تھی۔

”ہم سب سال میں دو بار چشموں میں ایک
جگہ یعنی بڑی حویلی میں اکٹھا ہوتے تھے، گرمیوں میں
اور پھر دیوالی کی چوٹی میں۔ بڑے ابا کام کی وجہ سے
بھی آتے تھے۔ کبھی نہیں لیکن تصدق بھائی جان کو
دیاں ہمیشہ دیکھا۔
اب عتا بھی سوچوں تو یاد آتا ہے کہ اس سال
بات کچھ اور ہی تھی، ہمیشہ سے کچھ الگ۔ رتو خالہ
بہت خوب صورت اور شوخ چٹل تھیں، تصدق
بھائی جان بھی خوب ڈھنگ تھے، ایمان سے ان
دونوں کی جوڑی بہت چٹکی تھی۔ رتو خالہ کا چھت
ہے جانا، پھر ان کے پیچھے تصدق بھائی جان کا ہم سب
بچوں کو لے کر وہاں پہنچنا، ہمارے ساتھ کھیتے ہوئے

ان کے درمیان خاموشی سے پروان چڑھتا وہ
کون سا جذبہ تھا یہ تو بہت بعد میں سمجھ آیا مگر وہ
دونوں، ہم سب بچوں کے غورٹ تھے بلکہ ہم سب ہی
اکثر ان کے درمیان ریلے کی کڑی، وجہ اور بہانا بننے
تھے، ہم ان کے ساتھ ہوتے تو کسی کو شک بھی نہیں
ہوتا تھا۔ مجھے اچھے سے یاد ہے، پہلے بھی تم سب کو بتایا
تھا جب کھیت میں جلتے ہوئے۔“



باز پرس، ڈانٹ ڈپٹ کر لیتا تو یہ بات اتنی نہ پھیل سکتی۔
اس بات کو تماشا دار اصل انہوں نے ہی بتایا تھا۔
رقو خالہ کا سب سے ملنا جلتا بند کر دیا گیا تھا۔
فون پر چوبیس گھنٹے ایک چہرے دار بٹھا دیا گیا، وہ
کمرے میں قید ایک مجرم ہوتی تھیں۔
ان کے ابا کے غصے سے سب ڈرتے تھے، کسی
نے چوں تک کرنے کی ہمت نہیں دیکھی، یہ بھی نہ کہا
کہ خاندان کے بچے ہیں کیوں تا دونوں کی شادی کر
دی جائے، اس میں برائی ہی کیا تھی مگر کسی نے مزہ نہیں
کھولا۔
اور روقو خالہ کے گھر والوں نے پندرہ دن میں
بہت دیکھ کر ان کا نکاح کر کے انہیں دور بھیج دیا اور پھر
بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ ان کے بھائیوں نے جب ایسا
یہ سلوک کیا، باپ کے بعد تو بھول ہی گئے انہیں۔
ان کی امی زندہ تھیں تو وہ بیٹی کی خبر گیری کرتی تھیں اور
مددگی۔ ان کی شادی کی خبر کسی انیم بم سے کم نہ تھی۔
تصدق بھائی جان بڑے ابا کے سامنے کھڑے
رہنے یا بولنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے مگر ان کا حال
چھپا نہیں تھا۔ ان کو اسپتال ایڈمٹ کر دیا تھا مگر اب
چھوٹیں ہو سکتا تھا۔ وہ کسی اور کی ہو چکی تھیں۔
یہاں سے رشتے داری اور ملنا جلتا بھی ختم ہو
گیا۔ پھر بڑے ابا کے یہاں سے کوئی حوصلہ نہیں آیا۔
کسی شادی بیاہ، ولادت، فونگی میں بھی دونوں
خاندانوں میں سے کسی نے پہل نہیں کی مانو جیسے دشمنی
کی بنیاد پڑی تھی اس بات سے مگر آج بھی دیکھ لو، ان
سب کے باوجود اب بھی ان دونوں کی خاموشی محبت
جوں کی توں ہے۔
ان کی آنکھوں کی اداسی، مزاج کی خاموشی اور
دنیا کی رنگینیوں سے کنارہ کشی اس بات کا ثبوت ہے
کہ دنیا نے انہیں الگ کر دیا مگر ان کے دل الگ نہ ہو
سکے، وہ ایک دوسرے سے دور جا کر خوش نہ رہ سکے۔
والدین کے حکم کے آگے تسلیم نہ کیا، مجبور ہو کر
شادی کی دنیا داریاں بھائی مگر محبت نہیں بھولے، وہ
اب تک اپنی پہلی اور آخری محبت بھرا رہے ہیں، ان

تھیں۔ چپے سے استاد تھیں۔
وہ ساری خلاؤں اور پھوپھوں سے چھوٹی
تھیں۔ اخبار میں مضمین اور افشاہی تھیں، کسی
کھوار پڑ پر اردو ادب سے متعلق نشریات میں بھی
حصہ لیتی تھیں، اس لیے سناتے ہوئے ان کا انداز
بہت خوب صورت اور دل کش ہوتا تھا۔ آواز کا اتار
چڑھاؤ اور ان کا لہجہ اس قدر کوثریہ دل پر بٹا دیتا
تھا۔ انہیں یوں لگتا، وہ بھی گاؤں کے اس گھر میں اور
محبت پر موجود ہیں جہاں یہ داستان رقم ہو رہی تھی۔
پھر محسوس ہوا کہ بڑے ابا کی نظر کی گئی کہ یہ
پریم کہانی اور رقیہ داستان ایسے میں بدل گئی۔
تصدق بھائی جان نے سب سے کچھ دار بننے کو چھوڑ کر
چلی تھیں گی اور اس بے توقف نے جا کر روقو خالہ
کے بھائی کو بے دی۔ بات کلی اور پھر دونوں کے ابا
ایک ضد پر اڑے کہ الگ الگ جگہ بیاہ کر دیں۔
دیکھا جاتا تو ان کی شادی میں کوئی بڑی رکاوٹ نہیں
تھی لیکن بس، دونوں بزرگوں کو اولاد کی من مانی اور
مرسی کرنا عداوت نہیں ہوا تھا پھر وہ چلی کا ملنا سب
سے بڑا ستم تھا۔ اس وجہ سے معاملہ بہت اچھلا ورنہ
شاید ایسا شدید نہ ہوتا کہ فوراً ہی ایرے فیرے
سے شادی کر کے دور بھیج دیا جاتا۔
ان کی نظر میں بچوں کی زندگی کے فضلے کرنے کا
احترام ان کا تھا، بچوں کا اپنی مرضی سے شخص و محبت
کے ٹھیل رہا جانا خاندانی لوگوں کا تیرہ نہ تھا۔
تصدق بھائی جان نے بہت ضد کی، کھانا چنا
چھوڑ دیا، ان کی امی کا دل تو پہل بھی گیا تھا مگر بڑے
ابا نہیں مانے۔ اور تصدق بھائی کی ضد نے بھی روقو
خالہ کو سب جگہ مشہور کر دیا۔ چھوٹے ناناک نے نزدیک یہ
بہت بڑی بے غیرتی اور ذلت کا مقام تھا کہ ٹوکی
ذات کا نام یوں سب جگہ کسی کے ساتھ لیا جائے،
چھین کے چاٹ لے ہوں، یہ ان کے بھائیوں کی
غیرت پر بھی تازیانہ تھا۔ اگر ان کے بھائی نے داویلا
نہ چاہا ہوتا، تصدق بھائی جان کی جان لینے پر آمادہ نہ
ہوتا، چپ چاپ گھر کی چار دیواری میں روقو خالہ سے

کی جدائی نے ان کی محبت کو امر کر دیا، عظیم بنا دیا۔ گھر
والوں نے انہیں ملنے نہیں دیا مگر اس کے باوجود کوئی
ان کی محبت کو بھول نہیں پایا۔
وہ دوسروں کی طرح ایک دوسرے کو بھول کر
اپنی زندگی میں مست اور مگن نہیں ہوئے بلکہ انہوں
نے خود پر خوشیاں حرام کر لیں، پھر ان کا دنیا میں دل
نہ لگا۔ میری ایک دور کی کزن کے رشتے دار رہتے ہیں
رقو خالہ کے گاؤں میں وہ بتاتے ہیں، غریب گھرانہ
ہے ان کا، وہ بہت بدل گئی ہیں، خاموش اور اداس
رہتی ہیں۔ اب تو سنا ہے شوہر کا بھی انتقال ہو گیا ہے،
ایک بیٹی کے ساتھ ہیں۔
”خاندان کے مطلب، دادا جان کے کسی
بڑے نے کوشش نہیں کی تھی ان دونوں داداؤں کو
سمجھانے اور پر امن کرنے کی؟“ یہ چاچا جان کی ضویا
تھی۔
”کچھ نے زہی سا سمجھایا، چند ایک نے آگ
میں حرید تیل ڈالا، ہر گزرتے دن کے ساتھ ان
دونوں کے گھروں میں فاصلے اور نفرت بڑھتی ہی گئی
تھی۔“
”ناموں کی زندگی تو پھر بھی اچھی رہی
مگر تو آئی کے لیے بہت برا لگتا ہے۔“ پھوپھو کی
فضا کے لہجے میں افسوس تھا۔
”ہاں، بے چاری کی زندگی میں کوئی سکھ نہیں
تھا۔ جتنی وہ خوب صورت تھیں نصیب اتنے ہی برے
لکھوا کے لائی تھیں، جانے کس سیم، غریب دور پار
کے پیسے سے بیاہ دیا تھا ان کے ابا نے اور پلٹ کر خبر
بھی نہیں لی، یہ تو دیوار میں زندہ چنوائے جانے سے
بھی برا تھا۔“ تو زہی آئی نے سر دھام بھری۔
وہ تنہا تھی جسے ہر بار یہ کہانی نا سمجھ میں آنے
والے، ناقابل بیان احساسات سے دوچار کروانی
تھیں۔ وہ بھی سب کی طرح اس داستان پر دم بخود
ہونا چاہتی لیکن تب ہی کوئی جذبہ اسے مجبور کر ہوش
میں لے آتا پھر وہ سنا نہیں چاہتی لیکن سنے بنا رہا بھی
نہیں جاتا تھا۔

جب بھی کوئی یہ قصہ شروع کرتا وہ وہاں سے
اٹھنے کا ارادہ کرتی لیکن پھر جیسے بھول جاتی۔ اب بھی
وہ اسی ناقابل فہم احساس میں گھری وہاں سے اٹھ کر
باہر چلی آئی اور فوراً پچھتائی مگر اب پلٹنا فضول تھا۔
گھر کی کے پاس کرسی پر ساکت بیٹھا احسن آہٹ پر
چونکا اور جرائیں اتارنے لگا۔ پیروں سے نکالے گئے
جوتے قریب پڑے تھے۔
”آپ کب آئے؟“ جو وہ دونوں سن چکے
تھے، ان باتوں کا اثر زائل کرنے کے کوشش میں اس
کے منہ سے پھلا ورنہ وہ اتنے بے تکلف نہیں تھے۔
آج اس کی بائیک نہیں تھی ورنہ اس کی آواز سے ہی
پچان لیتی تھی کہ وہ آ گیا ہے۔
”ابھی۔“ اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر
جواب دیا۔
”گنگو کے محلے میں وہ سدا کا کفایت شعار
تھاب کے ساتھ نہیں بس اس کے ساتھ۔ جرائیں
جو توں میں ٹھونس کر اس نے جھک کر جوتے ہاتھ میں
اٹھائے اور ہال کے سامنے سے گزر کر جانے کی
 بجائے دائیں طرف والی پکی سی گلی میں مڑ گیا۔
وہ اس کے سفید شفاف پیروں کو نظر سے اوجھل
ہونے تک دیکھتی رہی جو مٹی اور گنگروں پر پڑ رہے
تھے۔
وہ اب پچھلے محن سے باور چا خانے میں جائے
گا اور وہاں سے رابرداری اور پھر ہال کے سامنے
والے لڑنے سے اپنے کمرے میں۔
یہ بڑا سا چکر گھس ہال میں جی محفل سے بچنے
کے لیے تھا۔ ہال کے دروازے کے سامنے سے گزرتا
تو کسی کی نظر اس پر پڑی جانا بھی یا کیا ہوتا سب ہی دیکھ
لیتے اور پھر سب کی اجتماعی خاموشی ان باتوں سے
زیادہ اذیت ناک ہوتی تھی۔
چوں کہ یہ شادی کا گھر تھا اس لیے قریب اور شہر
والوں کا دن بھر نہیں ڈیرا تھا کل ہی دوسرے شہر سے
بھلی پھوپھو بھی مع خاندان آ گئی تھیں۔ ذرا دیر قبل
والی باتیں ہی تھیں شاید جو اس نے اب تک دفتر سے

جہاں تک اس کی بات تھی۔
 سارا دن کمر میں رہتا بھی ایک عمارت پر
 رہتا تھا۔ بریلی باتوں اور قصوں کے تیر سب کے
 درجے کے رکھنا آسان نہیں تھا۔ شاید اس سے بچنے
 کے لیے وہ لوگوں کے بدلنے دوسرے شہر جانا چاہتا
 تھا مگر جانی لے لے کر روک لیا تھا۔ وہ مگر ملے
 میں بطور اکیس کام کر رہا تھا۔ اس لمحے میں دوسرے
 شہر منتقل ہونے کے مواقع بہت زیادہ تھے۔
 اسے یہ سنیں تو اس نے اس ملازمت کا انتخاب
 اس لیے کیا تھا کہ کمر سے دور ہو سکے۔ وہ جانتی تھی
 بلکہ جی وہ نما کی شاکی تھی کہ اسے پھر ٹرانسفر کے
 بدلے میں اس نے جانی لے کر دوسرے شہر
 چلے جاتا تھا۔
 اندر فزیر آئی کی باتیں جاری تھیں۔ وہ وہیں
 کمری رہی پھر جب یہ سنیں ہو گیا کہ اب وہ اوپر اپنے
 کمرے میں چلا گیا ہو گا جب وہ اندر آئی اور دوبارہ
 جلی میں جانے کے بجائے باورچی خانے میں چلی
 آئی۔ جہاں فوجی بائی چائے چڑھا رہی تھی جو یقیناً
 اس نے اوپر جانے سے مانگی ہوگی۔
 ”شادی کے کمر میں ایک نیا نوکر صرف چائے
 بنانے کے لیے رکھنا چاہیے۔“
 اسے دیکھتے ہی انہوں نے اپنے اعزاز میں کام
 کی زیادتی کا شکوہ کیا۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ ہال کی گھنٹ
 کے منتظرین کے لیے چائے بنا چکی تھیں۔
 ”آپ کیلن مال دادی جان سے۔“ اس نے
 لہجہ کو کپ کٹاتے ہوئے کہا۔
 ”وہ میری دو چار تقریریں کر کے ہال دیتی
 ہیں۔“ فوجی بائی نے منہ بنایا۔ اسے ہنسی آ گئی۔
 دوسرے کاموں کے لیے اضافی ملازمین رکھے گئے
 تھے مگر باورچی خانہ اب بھی فوجی بائی تھا سنبھال رہی
 تھی۔
 ”میری مدد کرو اور یہ چائے اوپر اسن بابا کو
 بے آواز دھڑا دھڑا دے چڑھنے اترنے والی عمر گزر
 گئی اب میری۔“ کہتے وہ ٹھیک رہی تھیں۔

ان سب کے بچپن میں وہ چاق و چوبند اور
 جوان تھیں، دوڑتے بھاگتے ہوئے، بیس بول دفعتاً اوپر
 نیچے کرتے ہوئے وہ سب کے کام بخشنا تھیں لیکن
 اب ان کی نوجوانی کے دور میں، وہ اپنی توانائی نہیں دے
 تھیں۔ اسے فوجی بائی کی مدد سے انگار نہیں تھا مگر ذرا
 دیر پہلے، فزیر آئی کی باتوں کے بعد احسن کے پاس
 جانے لے کر جانا۔ صاف تو یہ دل کا چور تھا اور وہ چپکے
 چپکے چاہتی تھی یہ چور دونوں کے دل کا ہو جائے مگر ہر
 بار احسن کا رد عمل اسے خود سے شرمندہ اور اس کے
 لیے دکھی کر دیتا تھا۔
 ”لو۔“ وہ اپنے خیالوں میں الجھی تھی اور فوجی
 بائی نے کپ میں چائے نکال کر ٹرے سے تھما دی۔
 ”آج پہلے ہی اوپر کے بہت چکر لگ چکے
 میرے۔“ اسے چاروٹا چار ٹرے لیے اوپر جانا پڑا۔
 بڑھیاں چڑھتے ہوئے ہر تیرے پر دل کچھ پل کو روک
 سا جاتا تھا۔ اس کی وجہ ذرا دیر پہلے کا آمتنا سنا تھا۔
 دروازے کے باہر ٹھہر کر اس نے خود کو سنبھالا پھر ایہ
 کھلے دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوئی۔
 احسن چنگ کے قریب کھڑا فون میں کچھ تائب
 کر رہا تھا۔ ایسی صورت حال میں ہمیشہ وہ دونوں
 اتنے واضح طور پر بے آرام اور مضطرب ہوتے تھے
 بانو وہاں کوئی چی چی کرے، یہ نامناسب ہے، یہ ٹھیک
 نہیں، کہتے ہوئے ناگواری کا اظہار کر رہا ہوں۔
 ”جائے۔“ اس نے مقابل آ کر قاصلے سے
 ٹرے اس کے سامنے کی۔
 ”فوجی بائی نے بھجوائی ہے۔“ یہ وضاحتی اور
 انسانی چند الفاظ کمرے کی فضا کو اور پوچھ کر گئے۔
 احسن نے کپ اٹھا لیا۔ وہ فوراً ٹرے لیے
 واپس دروازے کی سمت بڑھ گئی۔
 ”تہنیت!“ خلاف امید پیچھے سے اس نے
 لپکارا اور وہ خود کو روکتے روکتے چلی تو چہرے پر پھر
 خوش گوشت حیرت چھپا نہیں سکی تھی۔ احسن اگر کسی ہتھیار
 اسے بولوں نہ پکارتا تو اب تک وہ اپنا مکمل نام بھول چکی
 ہوتی۔

”آئندہ فوجی بائی کہیں تو انگار کر دینا۔“ اس کا
 چہرہ ساٹ تھا اور آنکھوں میں اپنے اس رویے پر ہلکا
 سا تاسف بھی کہ وہ لحاظ، رعایت، مروت میں اس
 خاندان کا سب سے محتاط فرد تھا، ہمیشہ سب سے سکرا
 کر اور نرمی سے بات کرتا تھا مگر اسے خود کے ساتھ یہ
 رویہ رواں رکھنا پڑتا تھا۔ وہ سر ہلا کر باہر نکل گئی۔
 ”تو تمہیں کیا لگا تھا وہ شکر یہ کہیں گے یا یہ کہ
 اب سے چائے تم ہی لانا۔“
 اس نے لمحہ بھر کو خوش گمان ہوئے دل کو فٹپٹا۔
 ویسے اسے تو جی ایسی سرد مہری کی ہی ہوتی تھی لیکن
 ساری سمجھ داری اور حقیقت آشنائی کے بعد بھی یہ خوش
 گمان نہ ہوتا پھر دل کیسا!
 سلیمے اور دو جیسے حراج کا اس کا یہ کزن بس اس
 کے ساتھ ہی یوں روکھا سا تھا۔ اس کے تایا جان یعنی
 تھمدق حسین اور عفت کے دو بی بچے تھے۔ احسن اور
 نہما جس کی شادی تھی۔ اس کے بعد اس کے والد یعنی
 جمل حسین اور تازیہ اور وہ تین بہن بھائی تھے۔ اس
 سے بڑی عورت جو شادی شدہ تھیں، عورت سے چھوٹا
 اقدس، وہ سب سے آخری تھی۔ اس کے بعد چاچا
 تھمر حسین اور شمشاد چاچا تھی۔ جن کی ضویا اور
 زاہد دو اولادیں تھیں۔
 ان کے علاوہ کمر میں دادا جان اور دادی جان
 تھیں۔ بڑی اور چھوٹی پھوپھو بھی اسی شہر میں رہتی
 تھیں۔ اس کے سوا باقی کزنز کے ساتھ احسن کا رویہ
 بہت بے تکلف نہ سہی لیکن یوں تکلف والا بھی نہ تھا۔
 سب اس سے بلا جھجک بات کر لیتے تھے، وہ بھی نرمی
 اور توجہ سے سب کی سنتا تھا۔ چوں کہ وہ سب سے بڑا
 تھا سو ضروری ہو تو مشورہ صلاح دیتا، رہنمائی کرتا تھا،
 ہنستا مگر اتنا بھی نہ تھا۔
 بس ان دونوں میں فاصلہ سا تھا اور اسے اس کا
 شکوہ بھی نہیں تھا کہ کہیں گہرائی میں اس فاصلے کی وجہ
 اسے خوش کرتی تھی۔ پتا نہیں اسے کب احسن اچھا
 لگنے لگا تھا اور پھر وہ اس کے لیے سب سے اہم کیسے
 ہو گیا تھا۔ بچپن سے ہی اپنے ہم عمروں میں صرف

اسے ہی رقت آئی اور تایا جان کے ذکر پر احسن کا بے
 آرام ہونا محسوس ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے بھی یہ قصہ
 الجھانے لگا اور اسی وجہ سے اس نے احسن پر زیادہ توجہ
 دینا شروع کی پھر آہستہ آہستہ اسے یاد آئی۔
 اسے سوچنے، دیکھنے اور اس کی معمولی اور چھوٹی
 سی بات اور حرکت پر بھی غور کرنے کی عادت۔ اسے
 بڑھنے کا شوق اور عادت ہی تھی کہ اسے احسن کی بے
 آزادی کی وجہ بھی سمجھ آ گئی۔ اسے باپ کی جوانی کے
 دھواں دھار عشق کے قصے سے نفرت تھی۔ اسے باپ
 کی محبت بلکہ ایسی ہر محبت سے چڑھی اور اسی اور اس
 نے تایا جان کا قصہ اس کے لیے بھی بدل دیا۔
 وہ جو پہلے سب کی طرح شوق، اشتیاق اور
 عقیدت سے سنا کرتی تھی، اب الجھنے لگی تھی۔ اس کی
 سمجھ میں نہیں آتا تھا اسے یہ سن کر کیا محسوس کرنا
 چاہیے۔ احسن بچپن اور لڑپن میں بھی ٹی وی پر فلم یا
 سیریل کے ایسے مناظر براہ کھر چلا جاتا تھا یا نظر پھیر
 لیتا تھا۔ یہ اس وقت کی باتیں تھیں جب خود کو خود عشق
 محبت کی اپنی سمجھ نہیں تھی اور جب سمجھ آئی تو دیر ہو چکی
 تھی، احتیاط کا وقت گزر چکا تھا۔
 لاکھ جتنوں کے بعد بھی وہ بہ راز احسن سے چھپا
 نہیں پاتی تھی۔ اس سے زیادہ بے تکلفی سے فضا، ماریہ
 ، ضویا، مریحہ وغیرہ اس سے بات کر لیتی تھیں کہ وہ سلیمہ
 اور بڑو قسم کا تھا مگر اکہر یا بد مزاج یا خنگ نہیں تھا۔
 جب کہ وہ اس سے کترانی رشتی، سیدھے اس سے
 بات کرنے سے گریز کرتی تھی اور وہی ہوا کہ اس کے
 چھپانے کے جتن نے ہی سب اس پر عیاں کر دیا اور
 اسے لگتا تھا اسی بات نے احسن کو اس سے دور کر دیا
 تھا۔ پھر بھی اس کا رویہ ویسا جارحانہ اور نفرت انگیز
 نہیں تھا جیسی اس نے توقع کی تھی۔
 احسن کی یہ اچھائی اسے اور ہی جھکا اور تھکا دیتی
 تھی۔ اسے لگتا وہ اس کی آزمائشیں بڑھا رہی ہے۔ وہ
 اپنی طرف سے حتی المقدور کوشش کرتی تھی کہ ان کا
 سامنا نہ ہوتا کہ وہ اپنے احساسات اس سے چھپا کے
 رکھے۔

اعصاب شل ہونے لگے تھے۔

”زبردستی امتحان میں ڈال دیا تائی امی نے انہیں۔“ اقدس بھائی یا زائد کے ساتھ بیٹھ دیکھا مجھے۔ ”وہ سوچتے ہوئے نما اور اپنے مشترکہ کمرے میں آئی اور اس سے ایک بار پھر ٹیکہ سے کیا کروانا ہے۔“ کی تفصیل پوچھی۔

”کس کے ساتھ جاری ہو؟“
”حسن بھائی کے ساتھ۔“ اس نے آئینے میں دیکھتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔
”منہ تو دھولو۔“ اسے یونہی عبا یا اپنے دیکھ کر اس نے ٹوکا۔

”ٹھیک ہی ہے، دیر ہو جائے گی۔“ اس نے اسکارف لپیٹ کر ہن لگاتے ہوئے کہا۔
”دعا کرو۔ میں تائی جان کو انکار نہیں کر سکی۔“ اس نے آئینے میں اپنے پیچھے اس کے عکس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”موت ہے، لگے ہاتھوں بھائی سے پوچھ لینا کہ صرف تمہارے ساتھ ایسا رویہ کیوں ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔
”یہ ناممکن ہے میری جان!“ وہ مسکراتے ہوئے چلی۔

نما کی بیٹھی یہ ہی کوشش رہتی تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی تو پہل کرے اور یہ سردی دپوار گرائے۔ وہ اس کی تشویش پر بس ہاں میں ہاں ملائی یہ نہیں کہہ سکتی مگر وہ ایسا ہی چاہتی ہے، یہ عین اس کی خواہش کے مطابق ہے اور اسے اس کی وجہ بھی پتا ہے۔ اس کے جانے کے بعد نما بہتر پر گزرتی۔

ان دونوں کی زندگی پر باپ کی کھوئی، اور حوری اور ناکام محبت نے الگ الگ اثرات مرتب کیے تھے۔ یہ قصہ اتنا مشہور و مقبول تھا کہ وہ دونوں بہن بھائی کم عمری میں ہی اور اور ہے سب سن چکے تھے۔ حالانکہ یہ باتیں ان کی موجودگی میں نہیں ہوتی تھیں مگر ان سے چھپ بھی نہیں کی تھیں۔ انہوں نے اپنے باپ کی محبت کی کہانی ہی کی تھی، ان کی محبت

جائے چنگ کے ساتھ والی تالی پر رکھی ٹھنڈی ہوئی کھانے کی طلب دم توڑ تھی امی اور دن بھر کی کھان روکی ہوئی تھی۔ کس کو ہاتھ لگائے بنا وہ تولیہ فوراً کمرے کے کسل جانے میں چلا گیا۔

”چوٹی کب سے لیا ہے تم نے؟“ مغرب کے بعد وہ نچے پاؤں نہ پوچھا۔
”کھل کا ہی دن ہے امی اس کے بعد نہیں جاتوں گا۔ وہ اس وقت بھی باہر جانے کو تیار تھا۔“

”ہم کی کیا بار ہے؟“
”کچھ کی طرف اس کے بعد منڈپ والے کی طرف پھر گاؤں گا، آپ کو کوئی کام ہے تو کہنا۔“
”ستیل کے پاس جانا ہے۔“

”تو جیک۔“
”میں کہاں، پتھروں کا کام ہیں مجھے یہاں۔“
”خفت نے گردن موڑ کے پکارا۔“ تو؟“
”مئی تائی امی۔“ دائرے میں سر جڑ کر بیٹھے جمرٹ سے اس نے سراوٹ لیا۔

”انٹرنیشن اور فنگ والے پڑے دے آؤ تم نیکو، احسن لے جانے کا تمہیں۔“
”مجھے انڈر کس دے دیں۔ میں دے دوں گا، آپ فون کر لیں، کیا کو جانے کی ضرورت نہیں۔“
”فون پر سمجھانے والا کام نہیں ہے پتا، اسے بتانا اور سمجھانا پڑے گا جو کبھی ٹھیک سے کر سکتی ہے، انہوں نے۔“ اسے وہیں جمادیکر کہیں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ اٹھ گئی۔

”نما کے پاس کمرے میں ہی رکھے ہیں سارے شاپرز۔“ خفت نے کہا۔
”ایک بار پھر پوچھ لیا اس سے کیا کیا کرتا ہے اور ٹیکہ کوئی جماد یا سب کچھ کی طرح کر دے۔“

”مئی تر“ اس مختصر سفر میں احسن کو ہونے والی کوفت اور انہیں کا سوچ کر ابھی سے اس کے

دیکھی نہیں تھی، یہ حیثیت شوہر نہ بطور باپ۔

اس خلا اور کسی کا ہی اثر تھا کہ نما نے پہلے قدم پر لی محبت قبول کر لی تھی اور احسن نے اس سے بچنے کے لیے پہلے قدم پر ہی اپنے گرد بڑا سخت حفاظتی خول چڑھا لیا تھا۔ حمزہ اس کی ہم جماعت یسری کا بھائی تھا۔ جب یسری نے اسے بتایا کہ حمزہ اسے پسند کرتا تھا۔

جب یسری نے اس کے گھر رشتہ لے کر آنا ہے اور اس کے والدین اس کے گھر رشتہ لے کر آنا چاہتے ہیں تو اس نے فوراً ہاں کر دی، وجہ حمزہ سے زیادہ اس کے گھر کا ماحول تھا۔ اسے اپنی دوست کے والدین کا رشتہ اور ان کی باہمی مفاہمت بے انتہا پسند تھی۔ وہ اس ماحول کا حصہ بننا چاہتی تھی، جو اس کے گھر میں نہیں تھا۔ اس کے والدین دیر سے دو کناروں کی طرح تھے۔

ان میں باہمی محبت کا فقدان ہی تھا جو اس نے حمزہ کی محبت اپنا دل ٹٹولے بنا قبول کر لی تھی اور یہ ہی لا حاصل محبت تھی جو تصدق حسین نے بیٹی کا رشتہ کسی اگر گھر کے بنا قبول کر لیا تھا۔ گھر میں یہ بات چھری تو کسی کے کچھ کہنے سے پہلے انہوں نے فیصلہ سنا دیا تھا۔

”اگر نما کو لڑکا پسند ہے تو مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔ نما کی شادی اس کی پسند سے وہیں ہوگی۔“ اس اعلان کے بعد سب چپ ہو گئے تھے۔ حالانکہ ان کے خاندان میں پسند اور محبت غیر ممنوع تھے اور اس ممانعت کی وجہ بھی خاندان میں پھیلا ایک قصہ محبت ہی تھا۔ تصدق حسین اپنے باپ کو جتنا اور دکھانا چاہتے تھے کہ اولاد کی خوشی کی خاطر ان کی محبت قبول کرنا بھی والدین کے فرائض میں سے ایک ہے اور وہ اپنے تئیں اس میں کامیاب رہے تھے۔

نما جاتی تھی اس کا بھائی تو کو قریب کیوں نہیں آنے دیتا ہے اور تو بھی جس طرح اس کے اشتیاب اور آواز کا احترام کرتی تھی، وہ اس کے دل کا حال سنا جاتا تھا۔ اسے اپنے بھائی کے لیے دنیا بھر کی خوشیاں چاہیے تھیں مگر اپنی مرضی اور پسند نہ پونے بتا۔ وہ بس دعا کر سکتی تھی اور اب بھی وہی کر رہی تھی۔

وہ آگے بیٹھے یا پیچھے فیصلہ نہیں کر رہی تھی۔

”بیٹھو۔“ اسے یوں خیالوں میں گم دیکھ کر اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔
”آگے یا پیچھے؟“ جو سوچ، یہی تھی، وہ ہی زبان سے بھلا۔

”کہیں بھی۔“ اس نے کہا اور اندر بیٹھ گیا۔ وہ یونہی کھڑی رہی۔
”دیر ہو رہی ہے۔“ اس نے آگے جھک کر کھڑکی سے جھانک کر کہا اور وہ پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے لیے فردا دل تھا۔ اس کی اپنی خواہش اور ہنسنا دل بھی احسن حسین کے بعد آتے تھے۔

”ٹیک کا انڈر کس؟“ اس کا رواں رواں، ساری حیات اس کی سمت توجہ تھی مگر وہ بظاہر بے نیاز بنی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس نے پوچھا۔ اس نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے پتا بتایا، اس نے سن لیا۔ وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد وہ کشر کے پاس رکا اور اسے کچھ کہے بنا باہر نکل گیا۔ اندر سے دس پندرہ منٹ بعد واپس آیا اور دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گیا۔ جانے کتنے وقت بعد اس نے درزی کی دکان کے سامنے گاڑی روکی تو کو اندازہ نہیں تھا۔

سڑک کے اس طرف کار کھڑی کرنے کی جگہ نہیں تھی جہاں درزی کی دکان تھی۔ اس لیے اس نے یوٹرن لے کر دوسری طرف کار روکی تھی۔ وہ ساری تھیلیاں اٹھائے سڑک عبور کر کے دکان میں پہنچی۔ وہاں سارا کام سمجھاتے ہوئے اسے دوبارہ کھڑی کرنا پڑا۔ قاریغ ہوئی تو اسے احساس تھا کہ بہت وقت لگا ہے اور ابھی احسن کو کہیں اور بھی جانا تھا۔ وہ جگت میں باہر نکلی۔ سامنے وہ گاڑی کے پاس کھڑا اور حری دیکھ رہا تھا۔

”بہت دیر ہو گئی ہے، جہاں جانا تھا، وہ آفس یا شاپ بند ہی نہ ہو گئی ہو۔“ اس نے سوچا۔ عبا یا ضرورت سے زیادہ لمبا تھا اور اس نے نکلنے وقت

جلدی میں ہلکی سی ہنسی تھی۔ اب وہ حیرتوں میں الجھ رہا تھا۔ وہاں کھڑی گاڑیوں کے درمیان سے نکل کر وہ اپنی دھن میں تیزی سے اس طرف بڑھی اور اسے دیکھ رہا حسن پوری فوج سے چلا دیا۔

”تہنیت!“ اس نے ادھر دیکھا۔ وہ تھوڑا خوف زدہ اور گھبراہٹا تھا۔ وہ اسے پیچھے ہونے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ان سب میں سیکنڈز گئے تھے، وہ ایک دم پیچھے ہوئی۔ دائیں سمت سے بہت قریب اور تیزی سے زورنی گاڑی سے تو فگائی گئی مگر اس طرح لڑکھائی کر رہی تھی۔ خود کو بچانے کی کوشش میں بائیں ہاتھ کی ہینگی نیچے تک گئی تھی۔ خود کو سنبالتے ہوئے وہ ہاتھ زمین سے اٹھا تو ایسا شدید درد اٹھا کہ وہ بری طرح کراہ اٹھی۔ حسن سڑک عبور کرتا اس طرف آیا۔ وہ اسی دھن میں ہی زمین پر بیٹھی گئی۔

”تم ٹھیک ہو؟“ وہ جھکا۔ وہ سہارا دیتا اس سے پہلے ہی وہ کسی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے نیچے نکالیا گیا بایاں ہاتھ تمام رکھا تھا۔

”کیا ہوا۔۔۔ زیادہ تکلیف ہے؟“ چہرہ درد کا گواہ تھا اور آنکھیں لبالب بھری تھیں۔ ان نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟“ اس نے بغور اس کے وجود پر نظریں دوڑائیں۔ وہ بولنے کے قابل نہیں تھی سوئی میں سر ہلایا۔ جس طرح وہ دوسرا ہاتھ تھامے گی وہ گہری یا بڑی چوٹ کا اشارہ تھا۔

”آؤ۔“ ایک ہاتھ کے اشارے سے گاڑیوں کو روکنا۔ اس کے آگے چلا وہ گاڑی تک آیا اور اگلا دروازہ کھولا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اس نے کار آگے بڑھائی۔ جس رفتار سے اس کے آنسو گر رہے تھے اسی تیزی سے گاڑی دوڑ رہی تھی۔

اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی مگر چند منٹ بعد ہی گاڑی رکی تو وہ چونکی۔ وہ اسپتال کے سامنے رکے تھے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گیا تھا۔ اس کی سمت کا دروازہ کھلا تو وہ

یونہی کلائی تھا بے باہر آئی۔ درد اتنا تھا کہ اس میں نہیں آ رہے تھے۔ اسے ایک جگہ بٹھا کر ادھر دوڑتا رہا۔

وہ ایک بڑے اسپتال کے ایمر جنرل کی وارڈ تھے۔ ڈاکٹر نے دیکھا پھر اس کی کلائی کا اسٹیس نہیں بھی مگر کلائی کو غیر متحرک اور ساکن رکھنے کے ڈاکٹر نے اسپلٹ تجویز کیا تھا۔ ان سب میں اس کے گھٹنے لگ گئے تھے۔ وہ چپ چاپ اس کے کمر کے کمرے میں تھی۔ ساری گفتگو اور کام اسی نے کیے۔ سڑک سے یہاں تک اس کے ہر انداز اور کام پھری اور بگلت گئی۔ حسن گھروں کر کے بتا چکا تھا اسپتال میں ہی دردی دورانی لے چکی تھی۔ دائیں پھر اس نے اگلی نشست کا دروازہ کھولا تھا۔ وہ بیچ ٹکائے آنکھیں بند کیے بیٹھ گئی۔ اب کار کی رفتار جتنی نہیں تھی۔ دنیا نظر سے اوجھل ہوتے ہی اس کاٹوں میں اس کی آواز گونجی۔

”تہنیت!“

تکلف تھی، درد تھا مگر وہ ہوش میں تھی اور پریشان اور مگر مست سا بھاگتے دوڑتے دیکھتی رہی تھی۔

”تہنیت!“ اس کے اندر اس کی گھبرائی کی گونجی ہی رہی۔

وہ سب کے لیے تو تھی، یہاں تک کہ اس میں ٹیچرز بھی اسے تو کہتی تھیں۔ سب کو اس کا مشکل اور بڑا لگتا تھا۔ جانے کب اس نے لوگوں کا نام بھی تو بتانا شروع کر دیا تھا۔ اکثر تو شاہین اصل نام بھی بھول چکے تھے۔ وہ اس سے لے کر اکتھار نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے تو نہیں کہتا تھا مگر تہنیت بلانے والا وہ واحد انسان تھا۔ بے تکلفی سے یہ کوشش دیکھا ہوگی غلطی، بہت خاص۔ اب سب کی طرح عام سا تو کہتا بھی چاہتا تو نہیں کہتا تھا۔ دوا کا اثر تھا یا مسلسل اسے سوچنے کا کہ گھر تک اس کا درد عجیب ہو گیا تھا۔ دروازے پر ہی اس کے خستہ تھے۔

جہاں وہ اس کے سامنے آتی خود بخود اس کے ذہن میں باپ کی کہانی کا کوئی جملہ، جملے میں بیان ہوا کوئی منظر لہرانے لگتا تھا۔ خاندان کی سب سے فریٹک، لیبرل اور زائر آئی کی داستان کوئی نے اس کے ذہن کو اس قدر قدامت پسند کر دیا تھا کہ وہ محبت کے احساس پر بھی شرمندہ ہو جاتا تھا۔ ایک عجیب سا احساس جرم اور بے گنی اس کا احاطہ کرنے لگتی تھی۔ اسے لگتا وہ ہی سبب دہرایا جا رہا ہے۔ وہ بھی باپ کی اس کہانی کا حصہ بننا چاہتا ہے اسی کا شکار ہو رہا

”کیا ہوا؟“ ”کیسے ہوا؟“ جیسے سوال کے بعد اس کے لیے تھنیں تھیں پھر شادی میں اسپلٹ کا اجتماعی مدد۔ اس کی دوا میں اور قابل نہما کو تھا کہ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

☆☆☆

اس سے پہلے بھی اس کی کئی راتیں کروٹیں لے کر زوری تھیں لیکن آج خاص بات یہ تھی کہ وہ مسلسل اس خیال، اس تصور کو جھک نہیں رہا تھا۔ جانے وہ اس مسلسل کوشش سے تھک گیا تھا یا آج وہ تھوڑی سی بے ایمانی کرنا چاہتا تھا، جو اس نے ان سے بچنا چاہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کبھی بھار کی بے احتیالی آگے کے مشکل سفر کا حوصلہ پیدا کرنے کے لیے ضروری تھی۔ جسے اس نے اپنے لیے بھرمنوع قرار دیا تھا وہ اسی کا بیج اپنے اندر بونے چھٹی تھی۔

نیکی کی گفت و شنید اور الفاظ کی ہی مفاہمت کا علم تھا کہ ایک دوسرے کی مشکلیں نہیں بڑھاتے تھے، بلکہ ہی قاصدوں کا فیصلہ کر چکے تھے۔ کس کی نگاہوں کو تھوڑا تو گویائی ملی تھی یا نہیں تھا لیکن انہیں کہنے سننے اور سمجھنے سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

وہ جیسے غلطی سے سب طے کر چکے تھے کہ یہ ناممکن ہے، ان کے راستے ایک ہیں نہ منزل، دونوں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ وہ محبت سے منہ نہیں موڑ سکتی، اسے خود سے الگ نہیں کر سکتی اور وہ محبت قبول نہیں کر سکتا، اس کے لیے اپنی یا نہیں دانتیں کر سکتا۔

جہاں وہ اس کے سامنے آتی خود بخود اس کے ذہن میں باپ کی کہانی کا کوئی جملہ، جملے میں بیان ہوا کوئی منظر لہرانے لگتا تھا۔ خاندان کی سب سے فریٹک، لیبرل اور زائر آئی کی داستان کوئی نے اس کے ذہن کو اس قدر قدامت پسند کر دیا تھا کہ وہ محبت کے احساس پر بھی شرمندہ ہو جاتا تھا۔ ایک عجیب سا احساس جرم اور بے گنی اس کا احاطہ کرنے لگتی تھی۔ اسے لگتا وہ ہی سبب دہرایا جا رہا ہے۔ وہ بھی باپ کی اس کہانی کا حصہ بننا چاہتا ہے اسی کا شکار ہو رہا

ہے جس نے، ان تینوں کو محرومیاں دی تھیں اور اسے یہ منظور نہیں تھا۔ اسے لگتا تھا اس کی ماں اور نعماء کے مجرم اس کا باپ اور محبت دونوں ہیں مجبور کیے اپنی ماں اور بہن کے مجرم سے ساز باز کرنا۔

اس نے اس پر غصہ کرنا چاہا، اس بات پر اس سے ناراض ہونا چاہا کہ اس کی اجازت کے بغیر کیے یہ جہد اس سے منسوب کر سکتی ہے، جو ان کی زندگیوں میں حسرتوں اور محرومیوں کا کارن ہے، مگر وہ ناکام رہا۔

اسے تو کی کوشش اور ضبط محسوس ہوتا تھا۔ وہ اسے روک کرنے، دور کرنے، خود سے لڑنے جیسی مشکلوں سے خود ہی بچا لیتی تھیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ اس کے قریب نہیں پہنچتی تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتی اس کے راستے میں نہ آئے، اس سے دور رہے، ان کا سامنا کم سے کم ہوا اور بات تو بالکل بھی نہ ہو مگر ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے مکمل اجتناب اور پردہ ناممکن تھا۔ ایک دوسرے کی راہ میں آسانیاں بچاتے، ایک دوسرے کو مشکل سے بچانے، ایک دوسرے سے دور رہنے کی کوشش میں وہ ناچاہتے ہوئے بھی گریز اور اجتناب کے انوکھے رشتے میں بندھ چکے تھے۔ پھر کچھ اتفاق اور حادثات انہیں ساتھ وقت بتانے پر مجبور کر دی تھے جیسے آج ہوا تھا۔ چند ہی جملے انہوں نے ایک دوسرے سے کہے تھے لیکن اس سفر اور ساتھ نے ان کے اندر ایک دنیا آباد کی ہوئی تھی۔ وہ جاگتا رہا، اسے سوچتا رہا، خود سے لڑتا رہا۔

☆☆☆

دادا جان نے حسن کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ تصدق حسین کا دخل گھر کے معاملات میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ ان کی زندگی دفتر سے اپنا کمرہ اور اپنے کمرے سے دفتر تک ہی تھی۔ وہ زیادہ میل جول پسند نہیں کرتے تھے، خاندانی تقریبات میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے۔ کوئی ان سے کچھ کہتا بھی نہیں تھا نہ شکایت، نہ مشورہ کہ ملا جلا

کر دیا جا جا کر۔ دادا جان اب بچھتا تھے کہ ان کے بچے فیصلہ نے بیٹے کو دادی انفرنگ اور دادی دے دی گئی۔

ان کے بچے اور بچی نے انہیں شادی پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ ان کا بھی آخری حکم ثابت ہوا تھا۔ اس کے بعد جس طرح وہ دنیا سے کٹ کر الگ ہوئے تھے، انہیں بھی دکھ ہوتا تھا۔

ان کا خیال تھا شادی کے بعد، بیوی بچوں اور گھر وادی میں لگ کر، وہ ماضی بھول جائیں گے مگر ہوا کہ اس کے بعد وہ آزاد ہو گئے تھے۔ اب کوئی حریف کچھ اور ان سے منسوب نہیں سکتا تھا کہ فرماں برداری کا سب سے بڑا ثبوت وہ ان کی پسند سے شادی کر کے دے چکے تھے۔ اس کے بعد جیسے انہوں نے دنیا وادی تیاگ دی تھی۔ بچوں کی پیاری ہو، سالگرہ یا اسکول کا کچھ سارے معاملات ہمیشہ محنت نے ہی دیکھے تھے۔ ان کے سارے جذبات و احساسات دنیا میں ایک ہی شخص کے لیے تھے۔ باقی سب کے لیے جتنی کہ اپنے بچوں کے لیے بھی وہ اس معاملے میں کھال تھے۔

”مناسب اور صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ پہلے تمہاری شادی کرتے اس کے بعد نعمانی خیر!“ صدق حسین کو خود اس ذمہ داری اور فرض کا خیال ہی کہاں تھا۔ وہ تو نعمان کے لیے رشتہ آگیا تو انہوں نے اعلان کر دیا اور اب دادا جان یہ شکایت بھی، بیٹے سے کرنے کے بجائے اس سے کر رہے تھے۔

”لیکن اب تمہارا ذمہ دین کی بیٹی اور صالحہ کی بیٹی کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟“ انہوں نے اپنی بیٹی اور بچے جو اس کے سامنے تھے کی بیٹیوں کو امید وار بنایا تھا۔

”میں نے ابھی ایسا کچھ سوچا نہیں ہے دادا جان۔“

”تو سوچو۔ میں اب اور رعایت نہیں دے سکتا۔“

”ان کے علاوہ بھی کسی کا نام لیتا جاو تو مکمل

کے کو بیٹا۔“ دادی جان نے آہستہ سے کہا۔ بعد وہ یہ کہنے کے قابل ہوئی تھیں۔ بیٹے کے لیے یہ نہ کر سکنے کا افسوس انہیں اب تک تھا۔

”تم میرے سب سے بڑے پوتے ہو۔ اب تک تمہاری شادی ہو جانی چاہیے تھی، پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ اب اور دیر مناسب نہیں۔ سوچو اور فیصلہ کر لو اور اگر تم سے نہیں ہوتا تو کہہ دو، ہم خود ہی کی کا انتخاب کر لیتے ہیں تمہارے باپ کو تو عمر ہی نہیں ہے۔“

”دادا جان! دوائی۔“ احسن کے پیچھے سے آ کر تنو نے ہاتھ ان کے آگے کیا۔ اس نے دیکھا ہی نہیں تھا کہ وہ بھی کمرے میں ہے۔ دادا جان کو وقت پر دوائیاں دینے کی ذمہ داری نعمانی بھی جواب دینا کا رازہ طور پر اس نے اپنے سر لے لی تھی۔

”یہ بیوی دوائیاں مجھے تمہارے لیے مناسب لگتی ہیں۔“ دادا جان نے تنو کے ہاتھ سے دوائیاں لے کر منہ میں رکھیں، اس نے تپائی پر رکھا گلاس انہیں تھمایا۔ وہ ایک ہی ہاتھ کا استعمال کر رہی تھی۔

”آنے والی گرمیوں کی چھٹی میں تمہاری شادی کرنا ہے اور چھٹیاں زیادہ دور نہیں۔“ انہوں نے پانی پی کر گلاس اسے واپس کیا۔ اس نے جگ سے پانی اٹھ کر گلاس بھرا اور اسے ڈھانک کر باہر جانے لگی تھی کہ دادا جان نے نکارا۔

”خوب بیٹا اپنی تالی کو بھیج دو یہاں۔“

”جی دادا جان۔“ وہ سعادت مندی سے کتنی باہر چلی گئی۔ اسے کسی گوشے میں چھپ کر رونا تھا۔ وہ اس سے انتظامات کے متعلق پوچھتا چہ کر رہے تھے تب محنت بھی آگئیں۔

”مجھے بلایا آپ نے؟“ وہ بیٹے کو وہاں دیکھ کر حیران ہوئیں۔

”ہمم۔“ انہوں نے پرسوج سا ہنکارا بھرا۔

”نعمانی ذمہ داری سے بہک دوش ہونے کے بعد اب مجھے احسن کی فکر ہے، جلد اس کے فرض سے آزاد ہونا ہے، اس کام میں کسی وجہ سے دیر نہیں ہوگی

اب۔“ وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ اب بھی کہہ رہا ہے کہ سوچا نہیں، تم ماں ہو اب تم ہی نصیر الدین کی بڑی بیٹی اور ماریہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو۔“ فراخ دلی کا یہ مظاہرہ انہوں نے بڑے شاہانہ انداز میں کیا تھا۔ ان کے نزدیک روپیہ کی اس چمک پر ماں بیٹے کو خوش ہونا چاہیے تھا۔ ”چاچا جان!“ محنت نے فرش پر نظر نہانے بیٹے پر، ایک نظر ڈال کر سر کو دیکھا جو ان کے والد کے کزن بھی تھے۔

”بچوں کی زندگی کے فیصلے ان کی مرضی سے ہونے دیں، احسن جب اور جس سے کہے گا ہم وہاں اس کی شادی کر دیں گے۔ وقت وہی مناسب ہوگا جب یہ تیار ہو۔“ اتنے برسوں کی چپ اور پردہ واری کا مسلہ تھا کہ اب ان میں اپنے خیالات کے اظہار کا حوصلہ آگیا تھا۔ اب بھی انہوں نے اپنی زبان بچوں کے لیے کھولی تھی۔ اپنے لیے تو وہ خاموش ہی رہتی تھیں۔

”اس معاملے میں مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ زور دینی نہیں کرنی۔“

دادا جان پہلو بدل کر رہ گئے، دادی جان کا بچہ تھا تو حق اور بڑھ گیا اور احسن اپنی ماں کی اجازت اور صاف گوئی پر، حیران اور کچھ خوش سا انہیں دیکھنے لگا۔

”زور دینی کہاں آگئی اس میں؟“ اب کے ان کے لہجے اور آواز میں پہلے والا سکون نہیں تھا۔

”اے جو پسند ہے، اس کا نام اتنا پتا تدارے اور اگر نہیں پسند تو جو نام ہم دے رہے ہیں، ان میں سے کسی کا انتخاب کر لے، یہی تو کہہ رہا ہوں۔ اس کی پسند کے انتظار میں اسے بوڑھا تو نہیں کر سکتے، شادی بیاہ کی بھی عمر ہوئی ہے، وقت ہوتا ہے جو ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، کب سے میں سال کا ہو گیا ہے، اگر یہ فیصلہ اور انتخاب نہیں کر پارہا تو تم بدکردار، اس میں غلط کیا ہے؟“

”اُمی!“ اس نے ان دونوں کے چہرے دیکھ کر

اسی وقت فیصلہ کر لیا۔

”میں انتخاب کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں، آپ جسے پسند کریں مجھے قبول ہے۔“ محنت بیٹے کی نادانی پر مسکرائیں لیکن ساس سر کے سامنے بیٹے سے اس موضوع پر بات کرنے سے خود کو روک لیا۔ وہ نہیں جانتا تھا، قربانیوں کی طعنی حریف قربانی سے نہیں ہوتی۔

”چلو یہ اچھا ہے۔ محنت، اب تم جلد فیصلہ کر لو۔ ان دونوں کے علاوہ بھی کوئی تمہاری نظر میں ہے تو بتا دینا۔ شادی کا گھر ہے، یہاں سب ہی موجود ہیں۔“ دادی نے کچھ اور عائشہ بڑھادیں۔

”ٹھیک ہے چاچا جان۔“ محنت نے کہا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو وہ بھی کھڑی ہو گئیں۔

”نعمان کو مال جانا تھا، تم چھوڑ دو تو اچھا ہوگا۔“

”اب کون سی شاپنگ رہ گئی؟“ دادی جان نے حیرت سے پوچھا۔

”اس کی چند چیزیں ہیں جو وہ خود ہی جا کر لینا چاہتی ہے، ایک ہی شاپ سے خرید کر واپس آتا ہے۔“

”اے کہیں دیر نہ کریں، مجھے گیارہ بجے فرنیچر والے کے پاس پہنچنا ہے۔“ وہ دونوں ایک ساتھ کمرے سے باہر نکل گئے۔

نعمان کے ساتھ معمول کی طرح تنو بھی۔ اس کی چوٹ اور کلائی کے اسپلٹ نے اسے محدود کر دیا تھا۔ احسن کو کئی باتوں کا فہم ہوا۔ نعمان کے ساتھ ضویا اور فریحہ کو چھوڑ کر وہ اپنے کام پورے کرنے نکل گیا تھا۔ تمام وقت ماں سے کئی بات اور ایک چہرہ اس کے ساتھ تھا۔

☆☆☆

رقیہ کی اسپتال سے واپسی کے بعد سے وہ اور ستارہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھیں۔ وہ رورو کر اب تھک گئی تھی اور ماں کو بالکل خاموش چھت کو تکتا دیکھ کر اسے ہول اٹھ رہے تھے۔ وہ گا ہے گا ہے دروازے سے جھانک کر، ماں کے سینے کو دیکھ رہی تھی

جس میں ہوری حرکت اسے تلی دے رہی تھی۔ ان کی سانسوں کے درمیان کا وقفہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ جو سانس آتی جاتی تھی۔ وہ بھی بڑی قوت طلب تھی۔ وہ بار بار بچے پر ہاتھ رکھ کر سبز سبز رنگ کی نظر سے دیکھتا جا رہا تھا۔

وہ لہاں لہاں کی شادی کے ہوئے گیارہ سال بعد بچہ ہوا تھا۔ اس کے لہاں مٹا، کم گو اور تھوڑی پسند تھی۔ بہت بعد میں اس کے اندر ان کے مزاج پر سوال اٹھے تھے کہ آیا وہ بڑے سے ایسے ہی تھے یا انہاں سے شادی نے انہیں ایسا بنا دیا تھا۔

امیر گھرانے کی لاڈلی بیٹی، محبت کی پاداش میں اس غریب اور نیم گم سے بیاہ دی گئی تھی۔ اس محبت نے خاندان کو وہ داغ اور رسوائی دی تھی کہ کسی نے پلٹ کر نہیں دیکھا نہ اس سزا میں کچھ تخفیف کی۔ صرف اس کی تالی میں جو چوری چھپے اپنی لاڈلی کو روپے پیسے بچا کر لیتی تھی۔

دور دراز کا کوئی رشتے دار بھی ملے آ جاتا تھا۔ اکثر یہ ان کی بچپن اور جوانی کی سہیلیاں ہوتی تھیں۔ جانے مقصد کیا ہوتا تھا اس ملاقات کا کیونکہ ان کی آمد کے بعد اس کی ماں خوش ہوتی تھیں نہ مزاج خوش گوار ہوتا تھا۔ ان ہی ملاقاتوں کے دوران کی باتیں تھیں جنہیں جوڑ جوڑ کر کم عمری میں ہی اس نے ساری کہانی سمجھ لی تھی۔

اس کے گھر کا ماحول بھی ایک عام گھرانے جیسا نہیں رہا تھا۔ اماں نے سادی دنیا کا فہم اور اپنے ساتھ ہوئی زیادتیوں کا بدلہ شوہر سے لیا۔ ان کے اندر دنیا کو دینے کے لیے نفرت اور غیظ کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ وہ اپنے سب سے زیادہ محبت نہیں کرتی تھیں، اکثر معمولی باتوں پر جھگڑا کرتیں پھر خود ہی رونے بیٹھ جاتیں۔

اس کے لہاں ہمیشہ خیال رکھتے تھے کہ وہ ناز و فہم میں نہ پڑے۔ اس کا کام کاج کی عادی نہیں تھی۔ خود سے کوئی کام نہیں کیا۔ جتنا کر دیا ٹھیک ورنہ وہ خود ہی لکھا دیتے تھے۔ اس کے گھر بھانڈو پر چھائیک

کر لیتے، اسے اسکول کے لیے تیار کر کے بال بھی بنا دیا کرتے تھے۔ وہ اکیلی، سستی تھی جس کے لیے ان کے اندر نرمی نہیں کرتی تھیں۔ لیکن ان کے برتاؤ میں جو خوب دلی محبت اور اپنائیت تھی، وہ صرف اس کے لیے تھی ورنہ یوں لگتا تھا، ان کے اندر کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ دل چاہا تو گھر کا کام کیا، خود پر توجہ دی ورنہ سارا سارا دن کمرے میں بند پڑی رہتیں۔

بچی صبح اٹھتے ہی اماں سے لڑائی شروع کر دیتیں، انہیں دنیا بھر کی باتیں سنائیں، اپنی قسمت کو کوٹھیں، گھر والوں کی بے بسی اور خود غرضی پر رونی جھنجھکیں۔ ان کے دو ہی روپ تھے، بے حد خاموش یا جھنجھکی چلائی۔

اس نے بہت سوچا، قصور وار کون تھا۔ اس کے نانا تانی، اماں یا اس کے لہاں؟ اس کی ماں کا قصور تو کچھ ایسا نہ تھا کہ انہیں زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ تسلیم کر لیا جاتا۔ اگر باپ اور بھائی نے اسے ناک اور عزت کا مسئلہ نہ بنایا ہوتا۔ اس جگہ شادی نہیں کرتا تھی تو کم سے کم اپنے ہم پلہ لوگوں میں کرتے۔ یوں کسی غریب کے ملے باندھ کر دور دراز کے چھوٹے سے گاؤں میں تو نہ بھیجتے، اگر غصے میں بطور سزا ایسا کر بھی دیا تو یوں فراموش نہ کرتے، تعلقات رکھی بھی بحال تو رکھتے۔

اماں بھی اگر قسمت کا لکھا قبول کر لیتیں تو اس کے لہاں اچھے شوہر تھے۔ ان کے ساتھ وہ من پسند نہ سہی لیکن ایک آسودہ زندگی بتا سکتی تھیں۔ اگر اس کے ابا نے احساسوں کا بدلہ اتارنے کے بجائے شادی سے انکار کر دیا ہوتا تو...؟ انکار نہ کر سکے تھے تو بیوی کو یوں اس کے حال پر چھوڑ دینے کے بجائے اسے محبت دیتے، اس کی سب سے باتیں سمجھنے کے لیے کوئی پل ہی بناتے تو شاید اماں کی کنجیاں کچھ کم ہوتی تھیں۔

وہ بچہ سب سے بڑی رشتہ کی گھر بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتی تھی کہ اس کی ماں کے، اس انجام میں زیادہ غصہ کس کا تھا۔ اسے بھی اپنی ماں پر غصہ آتا تو

کبھی بہت ترس کبھی وہ بے حد تنگ دل محسوس ہوتیں بچے ساتھ رہنے والے دو اور انسانوں سے کوئی لگاؤ اور محبت نہیں تھی، تو کبھی وہ اسے محبت کی دیوی لگتیں، جس نے اپنی اور آخری محبت کچھ اس طرح بھائی بھی کر دیا تھا۔ بچہ تو چہرے کی خوشی، بیوی کی ہنسی اور دل کی امنگوں کا خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتا تھا۔

اس کے دکھ اور غم کو ایسے گلے لگاتا تھا کہ زندگی میں بچہ کی سرت کی منجائش اور جگہ نہ رہی تھی۔ لیکن جب سے اماں بیمار ہوئی تھیں۔ اسے ان میں سے کوئی ایک خیال بھی تنگ نہیں کرتا تھا۔ اس کی جگہ ماں کی زندگی کی دعاؤں نے لے لی تھی۔ وہ برسوں سے دل کے غار سے میں جلا تھیں۔ اب صحت توفیق ناک ہو چکی تھی۔ لہاں تو پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ نانا، نانی بھی دنیا میں نہیں تھے۔ دو بھائیوں کے لیے وہ زندہ اور مردہ برابر تھیں۔ ان کی تین بیٹیاں بھی تھیں، جن میں اس کی سب سے بڑی خالہ بھی بھاری ملے آتی تھیں لیکن اماں کی زبان کی کڑواہٹ اب کسی کو نہیں چھو سکتی تھی۔ ایک بار ان کی بچی کڑوی سکی باتیں خالہ کے بیٹے نے سن لیں تب سے ان کی آمد بھی بند تھی۔ اماں نے کبھی خود سے اپنے گھر والوں سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”تارہ!“ انہوں نے اسے پکارا۔
”جی اماں!“ وہ فوراً حاضر ہوئی۔

”زیادہ لمبا سفر نہیں ہے، بس سے جائیں گے تو آٹھ دس گھنٹے لگیں گے۔ تو تیار کر لے۔“

”کہاں جاتا ہے؟“
”کل صبح نکلیں گے۔“ انہوں نے جواب دینے کے بجائے وقت بتایا۔

”ذرا رفقہ کو فون لگا کر دے مجھے۔“ انہوں نے اپنی سہیلی کا نام لیا۔ جس سے وہ بھی بکھار بات کر لیا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر نے جو خبر انہیں سنائی تھی، انہیں اس دن کا تو کب سے انتظار تھا۔ اس زندگی اور دنیا میں وہ بس سانس لے رہی تھیں۔ ان میں جینے کی امنگ کب کی

دم توڑ چکی تھی۔ مگر اب ان پر بیٹی کی فکر سوار ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنیوں کے وہ خود غرض اور بے رحم روپ دیکھے تھے کہ کسی پر بھی اعتبار مشکل تھا۔ وہاں جانے کا فیصلہ بھی انہوں نے اعتبار کے بل پر نہیں کیا تھا۔ بہت لوگ مقروض تھے ان کے اور اب چند سے قرضے کا وقت آ گیا تھا۔

”یہ چند دن کے بجائے مہینہ بھر بھی نہیں نکلے گا۔“ وہ کپڑے تبدیل کر کے آئی تو غصیائے دوبارہ اسپلٹ کلائی میں پہتاتے ہوئے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اسے وہی جوڑا پہننا تھا جس کی آستین چڑھانے کی خاطر اسپلٹ ٹکٹا ضروری تھا۔ بڑھیلی آستیوں والے سارے نئے جوڑے اس نے رد کر دیے تھے جو انہوں نے اس حادثے کے بعد اس کے لیے منتخب کیے تھے۔

”مہندی نہیں لگائی، چوڑیاں نہیں پہن سکتی۔ کم سے کم ڈریس تو پسند کا پہننے دو۔“

”جھوٹ تو نہ کہو، مہندی بھی ہے اور چوڑیاں بھی۔“ فریج نے دوسرے ہاتھ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے صبح کی۔

”میرا مطلب ہے، تم سب کی طرح میں مکمل تیار نہیں ہو سکتی مگر جتنا ہو سکتی ہوں، اتنا تو ہونے دو، نہ نکلے یہ مہینہ بھر، چلے گا مجھے۔“

اس نے اسپلٹ پہن کر ہاتھ اوپر سینے پر رکھا۔ اسے ہاتھ لٹکانے سے منع کیا گیا تھا۔

”اب کوئی میرا میک اپ کر دو اور بال بھی بنا دو۔“ اس نے کمرے میں، جلی پانے، پر چل رہی تیاریاں دیکھتے ہوئے کہا۔ کسی سے پاسرمت نہیں تھی۔ تب ہی عزت بیٹے کو گود میں لیے لیے میں اندر آئیں۔

”ارے تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو...؟“
”ایک ہاتھ سے کیا کیا کروں...؟“ مزاج

اس کا بھی بگڑ رہا تھا۔ کیا کیا نہیں سوچا تھا اس نے شادی کے لیے اور وہ سب دھرا دیا تھا۔
”نہما کو لینے گا ڈی جارجی ہے پارلر تم بھی چلی

ماہر وہاں سے تیار ہو کر آجائے، مجھے اس کے ساتھ جانا تھا لیکن نہیں جا سکی۔" عزت کے چہرہ کے نیچے کو بھرا آ گیا تھا۔ انہوں نے سوتے نیچے کو جھولے میں لٹایا۔

"پہلے کیوں نہیں بتایا آپ!..." ماریہ جچی۔ "انہوں نے تمہیں ہی اپنا ہنٹ دیے تھے، میرا رہ گیا تھا آپ کی جگہ میں چلا جاتی ہوں۔"

"مجھے ہی ہوں۔" وہ کھڑی ہوئی۔ اسے بار بار دل پریشانی میں ایک ابھرا نہیں لگتا تھا جو بندے کی اصلی شکل کے طور پر چھپا کر میگزین والی ڈال دیتا ہے مگر اس وقت وہی ہیست تھا اور نہ اسے یوں دھلے چہرے سے شریک ہونا پڑتا۔

"دیکھو لہذا دل نہ دھڑکے، لیکن چلائے جائے۔" اس نے فوراً زانو لگوا کر لگا لگا۔ "میں بھی آ رہی ہوں، مگر..."

"میں کیٹ پر ہوں، جلدی آؤ۔" وہ تیزی سے باہر دوڑی راہداری میں دوسری طرف سے آ رہے احسن نے اسے ہما کر، دروازے کی طرف آتے دیکھا تو بے اختیار ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے ہوئے آواز دینے لگا تھا کہ ٹھیک کر رک گیا۔ ایسے بے قابو ہونا اس کا خاصہ نہیں تھا۔ مگر بے بزرگش کو چھوٹے فراک میں ٹھیل پینے وہ جس جگہ کا شکار مگی اسے لگا لگا کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔

"وہ اس کے راتے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم سست ہو گئے۔ اس وقت وہاں آخر میں ہال جانے والے چہرہ افراد ہی تھے اور اس کے مطابق احسن کو بھی ہال میں ہونا چاہیے تھا۔ چہل قدمیوں نے ایک دوسرے کو کھٹکایا۔ چہرہ دور دیکھ رہی تھی تو وہ بھی آگے بڑھ کر تیز چل گیا۔ تو کا کچھ دیر پہلے والا سارا جوش ہما کی مانند چھٹ گیا۔

"جلدی آنے کو کہا تھا میں نے۔" زاہد اسے سچل سچل کر قدم اٹھاتے دیکھ کر دور سے ہی کس زہا تھا۔

"سوری۔ اب چلو۔" اس نے غور سے نہیں کیا تھا، زاہد کی بغل والی نشست پر کون بیٹھا ہے۔ یہاں راستہ وہ خاموشی سے باہر دیکھتی رہی اور زاہد کے ساتھ باتوں میں مشغول، کامران کی نظر ہلکے ہلکے کر بیک و فوروٹ میں اس پر پھرتی رہی۔

تو کی بند آنکھوں کے پیچھے سیاہ کرتے شکار میں دروازے کے پاس کھڑا وہ خوب صورت انسان تھا جو اس کا نہیں تھا۔

واپسی میں باقی سب نے بھی اس کی خاموشی محسوس کی۔ اچھا تھا کہ اس کے پاس ہاتھ کی صورت میں ایک واضح بیان موجود تھا۔ اس سارے ہنگامے اور رنگ و روشنی کی محفل میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ نعماء کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر وہ اٹھ کر باہر چلی ہوئی جا نے کے ارادے سے، ہال کے دروازے سے باہر نکلی ہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے پکارا تو مڑی۔

"تو؟"

"جی۔" کامران اس کے ماسوں کی ہوشیار نگاہ چھوٹا بھائی تھا۔ اس کے رکتے پر وہ حریف قریب آیا۔ اسے لگا تھا کوئی کام کی بات ہو چکے گا، یا خواتین والے حصے سے کسی کو بلانے کے گا مگر وہ جس طرح غور سے اسے دیکھ رہا تھا اسے اچھا نہیں لگا۔

"کوئی کام تھا؟"

"جی، بہت اہم۔" وہ مسی خیر انداز میں مسکرایا۔

"سوری۔ اب چلو۔" اس نے غور سے نہیں کیا تھا، زاہد کی بغل والی نشست پر کون بیٹھا ہے۔ یہاں راستہ وہ خاموشی سے باہر دیکھتی رہی اور زاہد کے ساتھ باتوں میں مشغول، کامران کی نظر ہلکے ہلکے کر بیک و فوروٹ میں اس پر پھرتی رہی۔

تو کی بند آنکھوں کے پیچھے سیاہ کرتے شکار میں دروازے کے پاس کھڑا وہ خوب صورت انسان تھا جو اس کا نہیں تھا۔

واپسی میں باقی سب نے بھی اس کی خاموشی محسوس کی۔ اچھا تھا کہ اس کے پاس ہاتھ کی صورت میں ایک واضح بیان موجود تھا۔ اس سارے ہنگامے اور رنگ و روشنی کی محفل میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ نعماء کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر وہ اٹھ کر باہر چلی ہوئی جا نے کے ارادے سے، ہال کے دروازے سے باہر نکلی ہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے پکارا تو مڑی۔

"تو؟"

"جی۔" کامران اس کے ماسوں کی ہوشیار نگاہ چھوٹا بھائی تھا۔ اس کے رکتے پر وہ حریف قریب آیا۔ اسے لگا تھا کوئی کام کی بات ہو چکے گا، یا خواتین والے حصے سے کسی کو بلانے کے گا مگر وہ جس طرح غور سے اسے دیکھ رہا تھا اسے اچھا نہیں لگا۔

"کوئی کام تھا؟"

"جی، بہت اہم۔" وہ مسی خیر انداز میں مسکرایا۔

"آپ مجھے اچھی لگی ہیں اور میں جلد امی سے بات کروں گا۔"

"امید ہے یہ جاننے کے بعد آپ انکار نہیں کریں گی۔"

اس کے کمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی کوئی بات کرے گا۔ وہ ہر طرح گڑبڑاتی اور اس سے کچھ کہے بغیر واپس اندر کی طرف مڑ گئی۔

یہ تو ہونا ہی تھا مگر کامران کی بات نے، اچانک ہی اس کی زندگی کا اگلا بڑا ڈھکاسنے لاکڑا کیا تھا جسے وہ جانے کیسے اب تک بھولے ہوئے تھی۔

اس کے ساتھ ہمیشہ ہی دور دور سے احسن کو دیکھتے ہوئے جینے کا تصور تھا۔ ذرا دیر پہلے کامران نے اسے اس غفلت کی نیند سے جگا دیا تھا۔ احسن کو کسی اور کے ساتھ دیکھنے کا خیال، اذیت ناک سی مگر وہ اسے قبول کر چکی تھی لیکن اس کی اپنی زندگی میں کوئی دوسرا اسے قبول نہیں تھا۔ محبت احسن کی دشمن تھی، اس کی تو نہیں۔ وہ تو اسے عمر بھر گلے لگائے رکھ سکتی تھی۔

اس کا فون بار بار بج رہا تھا۔ آخر اس نے آواز بند کر کے ٹیکے کے نیچے ڈال دیا۔

"دادا جان میرا نام بھی تو لے سکتے تھے۔" اب تک صابر رہا دل چھپتے لگا تھا۔ اس نے ہاتھ کھٹنوں کے گرد پھیلانے تو نظر اپلٹ پر بڑی۔

"کاش ہاتھ ہی توٹ جاتا، مخدور ورنہ لڑکی کی کو پسند ہی نہ آتی۔" وہ رورہی تھی۔

"پھر تائی امی کو مجھ پر رحم آتا اور وہ میری ان سے شادی کروا دیتیں، تائی امی کی بات تو وہ ٹال ہی نہیں سکتے۔"

سوچے پر پابندی تھی نہ کوئی فکڑ تھا۔ مگر سارے ایلے سیدھے قیاسوں کے بعد بھی، یہ حقیقت جوں کی توں تھی کہ انہیں نہیں ملتا۔ وہ کیلے ٹیٹو سے میک اپ صاف کرتے ہوئے روئے جاری تھی۔ کامران کی بات کے بعد اسے میک اپ پر ہی غصہ آ رہا تھا۔

"کاش! میں احسن سے اپنے جذبات چھپا پاتی؟" اسے مسئلہ محبت سے تھا، تو سے نہیں۔ اگر وہ اس کی محبت سے بے خبر ہوتا تو... وہ شاید یوں بچتا اور کتراتا نہیں۔

سوچے سوچے رونے کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تب ہی آہستہ سے دروازہ کھول کر کوئی اندر آیا۔ اس نے سر اٹھایا تو لگا وہم ہوا ہے مگر نہیں وہ قدم اٹھاتا آگے آ رہا تھا۔

"چلو۔" اس نے اپنے جوتے سے فرش پر ایک

وہ یہ سب سن کر دل گڑبڑا رہی تھی کہ آج نہیں تو کل

طرف رکے اس کے سیدل چنگ کے قریب
 سرکائے۔
 ”کہاں؟“ اس نے جھٹ پٹ ٹٹو سے آنسو
 صاف کیے اور حیرت سے پوچھا۔
 ”اچھا۔“
 ”اچھا۔ کیوں۔ سب خیریت ہے
 ؟“ کہاں کی دوسرے سرائے لگے۔
 ”وہ اس لیے۔“ اس نے انگلی سے کلائی کی
 طرف اشارہ کیا۔
 ”اور۔۔۔ اسی نے مجھے آپ کو۔“ وہ سمجھ
 گیا۔ ”اتنا درد نہیں ہے، میں نے میڈیسن لے لی
 ہے۔“ اس نے جھوٹ کہا۔
 ”دینے سے تو نہیں لگ رہا۔“ اسے حیرت
 کے جھکے پر جھکے لگ رہے تھے۔
 ”اس سے نہیں۔“ وہ روانی میں بولے
 گئی کی کوک گئی۔
 ”تو کس چیز سے؟“ یہ الفاظ اس کی زبان سے
 ادا نہیں ہوئے لیکن اس کے چہرے پر درج تھے۔ وہ
 جس طرح جم کے کھڑا تھا وہ جواب کا مطالعہ تھا۔ اس
 الفاظ پر اسے لگا وہ حریف خوش و خوشوں سے
 روکنے لگی۔
 ”اسی سے کہیں، میں ٹھیک ہوں، پریشان نہ
 ہوں، وہ اپنی والا ہاتھ سینے پر رکھ کے دوسرے
 ہاتھ سے کپڑے سنبھالتی چنگ سے اتری۔
 ”بس، چلیں گے۔“
 ”وہ تو نے لی تھی۔“ وہی سنجیدہ انداز جو اس
 سے بات کرتے ہوئے ہوتا تھا۔
 ”ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ بس لیے اٹھ رہی تھی۔“
 کہتے ہوئے اس کا ہاتھ آراکھی میز کی سمت اٹھا تھا۔
 اس نے مزہ کر دیکھا وہاں دوایوں کا لٹافہ اور پانی
 کی بوتل دی گئی۔ آراکھی میز کو اس نے لٹافہ
 اور بول اٹھائی اور واپس آ کر دونوں چنگ پر رکھ
 دیے۔
 ”لے لو۔“ اس کے ہیکے چہرے پر ایک نظر

ڈال کر وہ پلٹا۔
 ”میں اس لیے رو رہی تھی کہ۔۔۔“ پیچھے سے
 آتی، اس کی آواز پر وہ رک گیا۔ دھک دھک کرنے
 دل کے ساتھ وہ بھی رک گئی تھی۔ اتنا کہنے کے بعد
 اب آگے کہتے ڈر لگ رہا تھا۔ احسن پلٹ کر سوالیہ
 نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
 ”نعمہ کے بعد اگلا نمبر میرا ہو سکتا ہے اس کم
 سے رخصت ہونے کا۔“ اپنی زبان سے ادا ہو رہے
 لفظوں پر وہ خود حیران تھی۔ اپنی جرات اس میں جانے
 کہاں سے آگئی تھی۔ احسن نے سنا، چند بل اسے
 دیکھا اور مزہ کر کرے سے نکل گیا۔ وہ بے دم کی پیچھے
 چنگ پر بیٹھ گئی۔ ایک خوش فہمی کا جھٹک جو اس کے آس
 پاس منڈلاتا پھر ہاتھ وہاں بچھ گیا تھا۔
 گریز، نکلتا اور تکلف میں لپٹی توجہ، سب نے
 اسے کسی اور ہی گمان میں مبتلا کر دیا تھا جو اس وقت
 بری طرح ٹوٹا تھا۔
 ”میں نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا، وہ محبت کو
 گلے لگای نہیں سکتے اور اب تو بالکل ہی نہیں۔“
 اس نے دوایاں لیں کہ اس کے بعد نیند آ جاتی
 تھی۔ صبح جاگی تو اس کے اس طرح بتاتے مگر
 آ جانے اور مصیبت کے وقت عتاب رہنے پر سب نے
 ہاتھیں ستائیں۔ کچھ ناراض تھے اور کچھ اس کی تکلیف
 پر فکرمند۔
 ”دوایاں وقت پر لو، بھولنا مت کل کی طرح
 درندہ لیے میں پھر درد کے مارے رونے لگو گی نہیں تو
 ایسا کرو، ایک بار ڈاکٹر کو دکھا لو۔“ نازیہ نے کہا۔
 ”دوا لے لی ہے ای! اس سے آرام ہو جاتا
 ہے۔“ سچ تو یہ تھا کہ اسے ہاتھ میں کوئی تکلیف نہیں تھی
 ”درد تو وقت ہو جاتا تھا۔“
 ”ڈاکٹر اور اچھا کی کوئی خواہش نہ ہو۔“
 آپ نے احسن بھائی کی ضرورت نہیں ہے، کل
 ”احسن آیا تھا؟ میں نے تو نہیں بھیجا تھا۔“
 ”آں۔۔۔ اچھا۔۔۔ کی کام ہے آئے ہوں
 کے، میں رو رہی تھی تو کہا ڈاکٹر کے پاس لے چلے

ہیں اس لیے مجھے لگا شاید آپ نے بھیجا ہوگا۔“
 ”وہ کہاں لے جاتا ڈاکٹر کے پاس، کتنا
 معروف تھا کل وہ بچہ۔“ اس کے آس پاس پھر جھٹک
 منڈلانے لگے۔
 ☆☆☆
 رفیقہ سے بات کرنے کے بعد اماں نے اگلے
 دن کا سفر رد کر دیا تھا۔ اس کے ایک ہفتہ بعد پورے
 دس گھنٹے بس میں طے کر کے وہ ایک بڑے سے مکان
 کے آگے رکشے اتری تھیں۔ اس ایک ہفتے میں
 اماں کی طبیعت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی ہی گئی تھی۔ ان
 کے پاس سامان کا ایک بیگ تھا۔ ایک جوڑی ان
 دونوں کے کپڑے اور باقی جگہ دوایوں نے لے لی
 تھی۔
 بڑے سے دو منزلہ مکان کے گیٹ پر کوئی
 چوکیدار نہیں تھا۔ اندر آنے کے بعد ابھی چند قدم ہی
 چلے تھے کہ دروازے میں فوجی ہتھیار ہو میں۔
 ”کس سے ملتا ہے آپ کو؟“ انجان اور تنے
 چہرے پر دیکھ کر انہوں نے ذرا سختی سے پوچھا۔
 ”سکات حسین اور تصدق حسین سے۔“
 ”آئیے۔“ انہیں ہال میں بٹھا کر وہ اندر
 اطلاع دینے جانے لگیں تو انہوں نے پیچھے سے آواز
 دی۔ ”سنو! ان سے کہنا قید ملنے آئی ہے۔“ فوجی جاگی
 کے کان کھڑے ہو گئے۔ برسوں سے یہاں کام
 کر رہی تھیں۔ یہ کہانی انہیں بھی ازیر تھی۔ ان کے ہاؤ
 بھاء ہی بدل گئے۔ وہ تیز قدم اٹھائی اندر بھاگیں۔
 تصدق حسین ہی کیا کسی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں
 آ رہا تھا۔ حسن ڈھل بھی چکا ہو تو بھی اپنے تئیں جھوڑ
 جاتا ہے مگر قید حالات کے جس گرداب میں پھنسی اور
 پٹی تھیں، اس نے انہیں سر اپا بدل دیا تھا۔ رہی کسی
 کسرباری نے پوری کر دی تھی۔
 تصدق حسین کی تم آنکھیں کسی سے مخفی نہیں
 تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ صندوق کا جبر کاٹ کے
 ملے ہیں مگر ان کے دل میں، سوچنا جاہت کا سمندر

اسی طرح ٹھانپیں مار رہا تھا جیسا آج سے بیس سال
 پہلے۔ ہال میں محل حسین کے علاوہ مگر سب ہی بڑے
 موجود تھے اور ساری نوجوان نسل کھڑکیوں اور
 دروازوں سے کان لگائے کھڑی تھی، جن میں فضا،
 فریج اور ماریہ بھی تھیں۔
 احسن ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا اور نعمتی مومن
 پر تھی۔ دور دراز گاؤں سے آئے دادا جان کے کچھ
 مہمان اب بھی اوپر موجود تھے۔ ہال میں اتنے نفوس
 موجود تھے مگر سنا قبرستان جیسا تھا۔
 ”بڑے ایلا! میری زندگی کو عبرت ناک سزا
 بنانے میں جتنا قصور میرے ابا کا تھا، اتنا ہی آپ کا
 بھی ہے۔“
 جذبات سے عاری لہجے میں وہ علی حمید کے
 شروع ہوئی تھی۔ انہوں نے اس وقت بھی کبھی بڑے
 ابا کی آنکھوں میں دیکھ کر بات نہیں کی تھی۔ سرجھا کر
 سلام کرتیں اور چلی جاتیں مگر آج کی رقیہ میں اس
 وقت کی رقیہ کی کوئی بات نہیں بچی تھی۔
 وہ سب انہیں دیکھ کر کم حیران نہ تھے اس پر ان کا
 لہجہ اور باتیں۔ وہ کہانی جس کا بڑا گہرا اثر وہاں موجود
 ہر شخص کی زندگی پر پڑا تھا پھر بھی کسی نے اسے زبان پر
 لانے کی غلطی نہیں کی تھی، وہ سب ان سے اتنی صاف
 اور کھلی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔
 ”ابا ضد پر اڑے تھے تو آپ انہیں مناسکتے
 تھے، آپ بڑے تھے، وہ آپ کی بات مان جاتے
 لیکن آپ دونوں نے اپنی اتنا اور نام نہاد عزت پر
 ہماری خوشیاں اور محبت قربان کر دی۔ میں نے کسی کو
 معاف نہیں کیا ہے نہ قیامت کے دن کروں گی۔
 میری زندگی گزر گئی، اب مجھے اپنی بیٹی کی فکر ہے۔ میرا
 دل ناکارہ ہو چکا ہے، یہ بس اب کسی بھی وقت بند
 ہونے والا ہے۔
 بات کرتے ہوئے بھی ان کا سانس پھول رہا
 تھا۔ چہرے اور پیروں پر سوچن تو تھی ہی، سرخی بھی
 زیادہ بڑھ گئی تھی۔
 تصدق حسین کے ابگ ابگ سے بے قراری

جھک رہی تھی۔ ان کے اندر بہت سے سوال تھے مگر وہ سب کے سامنے پوچھ نہیں سکتے تھے پھر رقیہ بھی رکے کو تیار نہ تھیں۔ وہ اپنی کہنے آئی تھیں اور کہے جاری تھیں۔

”میری اور میری اولاد کی افلاس بھری زندگی کے ذمہ دار میرے بھائیوں اور ماں باپ کے ساتھ ساتھ آپ بھی ہیں۔ مجھے اپنے بھائیوں سے اب بھی کسی اچھائی کی امید نہیں ہے۔ اس لیے یہاں آئی ہوں آپ کو طمانی کا ایک موقع دینے کہ آپ باغی کی غلطی سدا رہیں، آخرت میں شرمندگی سے بچ جائیں، میری آہوں اور انصاف کی خاموش التجاؤں کا رخ بدل جائے۔“ انہوں نے نظروں کا رخ تصدق حسین کی سمت کیا۔

”میری بیٹی کو تھکے بھری صحت اور ایک مضبوط قلب دے کر باغی کی طمانی کر لیں، مجھے گے گے مجھے سب مل گیا ہے جس کی کمی میں نے خواہش کی تھی۔“ وہ آواز مضبوط رکھنا چاہتی تھیں، اس میں کامیاب بھی رہیں مگر آنکھیں بھر آئی تھیں۔ تصدق حسین کے من میں بھی کوئی پندراسا اٹکا تھا۔ ستارہ ماں کی بات سن کر ششدر رہ گئی۔ یہاں آنے کا یہ مقصد تو اس کے کمان میں بھی دور دور تک نہیں تھا۔ وہ اسے زیادہ مل کر کچھ بتائی نہیں تھیں، کہیں ساتھ چلنے کا کہا تو اسے لگا تھا کہ وہ اسے اپنے بھائیوں کے پاس لے جا رہی ہیں۔ وہ تو جب انہوں نے جو باجی کو بتایا کہ کس سے ملتا ہے تو وہ چونکی۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ بھی یہاں آئی نہ انہیں آنے دیتی۔

”تمہاری طبیعت ٹھک نہیں ہے، تم ابھی آئی ہو۔ آرام کرو بعد میں سکون سے بات کرتے ہیں۔“ وادی جان نے کہا اور نازیہ کو دیکھا۔ یہ تماشا بیس سال قبل والے قماشے سے زیادہ نقصان دہ تھا۔

”ابن دونوں کو کمرے میں لے جاؤ اور کھانے کا دیکھو۔“ نازیہ اور شمشاد آگے بڑھیں۔ عفت سپات

چہرہ لیے کھڑی تھیں۔

”نہیں۔“ رقیہ نے ہاتھ اٹھا کر ان دونوں کو روکا۔ ”میں اتنی دور سے یہاں آرام کی غرض سے نہیں آئی ہوں، میرے پاس وقت نہیں ہے، مجھے اپنی بیٹی کے مستقبل کی یقین دہانی چاہیے کہ وہ یہاں محفوظ رہے گی۔ اس کے بعد شاید میں آپ سب کو معاف کر دوں حشر میں آپ کا دامن چکڑ کے اللہ سے انصاف کا تقاضا نہ کروں ورنہ میرے دل کو جو تکلیف اور اذیت آپ نے پہنچائی ہے اس کا حساب آسمان نہیں، جتنا میں ترپتی ہوں، جتنا میں نے سہا ہے، اس کے بعد میری آہ بے کار نہیں جائے گی۔“ سب کو بھیے ساتھ سو گھ گیا تھا۔ ان کے الفاظ سب ہی حاضرین کو بے چین کرنے کے لیے کافی تھے۔

”تصدق“ ان کی بھی آواز پر جہاں تصدق حسین کی دنیا بدلی وہیں کہیں ماتم پھیل گیا۔ ”میں ستارہ کو تمہارے حوالے کرتی ہوں کہ تم اسے در بدر رلے نہیں دو گے، اس کی حفاظت کرو گے، ہمیشہ اس کا خیال رکھو گے، اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور مجھے تمہارے علاوہ کسی اور پر بھروسہ نہیں ہے، میں سکون سے سربمعی نہیں سکتی اگر۔۔۔“

وہ آگے بول نہ سکیں اور سینے پر ہاتھ رکھ کے لمبی سانسیں لینے لگیں۔

ستارہ نے انہیں تھاما۔ وہ بھی رو رہی تھی۔ اس کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کی ماں یہ سب کیا کر رہی ہے۔ اسے شرمندگی ہو رہی تھی، اپنا یوں تماشا بننا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ ان کی حالت کے پیش نظر انہیں روک بھی نہیں پا رہی تھی۔

”میں ستارہ کی ذمہ داری لیتا ہوں، تم اس کی بالکل فکر نہ کرو۔ میں۔۔۔“ تصدق حسین کی بھیگی سی لڑائی آواز میں بھی بے قراری تھی۔

”اماں! اماں! اماں! ستارہ کی چیخوں میں ان کی بقیہ بات دب گئی۔ وہ بے سندھ ہو کر اس کی ہاتھوں میں جمول رہی تھیں۔

فورا انہیں اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹر نے انہیں انتہائی مہمداشت میں داخل کر دیا تھا۔

تصدق حسین، ستارہ کے ساتھ پورا وقت وہیں تھے۔ باری باری وہ اور ستارہ ان سے مل کر آئے تھے۔ انہوں نے تصدق حسین سے وعدہ لیا تھا اور ستارہ کو صرف انہیں براہ اعتبار کا درس دیا تھا۔ احسن کو خیر ہوئی تھی۔ دادا جان نے رقیہ کے بھائیوں کو فون کر کے ان کی پیاری کی خبر کر دی تھی۔ ڈاکٹر نے کوئی حوصلہ افزائیاں نہیں کہی تھیں۔ ستارہ یہ سب پہلے سے جانتی تھی۔ ڈاکٹر نے چند دن قبل ہی بتا دیا تھا کہ ان نے پاس کتنا وقت بچا ہے۔ ان کا دل اب مزید جینے کے لیے تیار نہ تھا۔

گھر میں کوئی اس پر بات نہیں کر رہا تھا۔ ایک عجیب سی خاموشی چھائی تھی۔ سب عفت سے نظریں چار رہے تھے۔ موت سے مل ہی گھر کی فضا مکی ہوئی تھی۔ شادی کے کچھ مہمان جو اب تک موجود تھے، انہوں نے اس عجیب و غریب صورت حال میں رخت سنا یا نہ سنا مناسب سمجھا۔ فوزیہ آنٹی جو اپنے گھر چلی گئی تھیں، وہ یہ سن کر واپس آ گئیں۔

ایک دن اور ایک رات اسپتال میں گزارنے کے بعد رقیہ اس دنیا سے چلی گئیں۔ پورا وقت ستارہ کے ساتھ تصدق حسین بھی وہیں تھے۔ ان کے دونوں بھائی تدفین میں شریک ہونے آئے تھے۔ جسے دادا جان نے، اپنے گھر کی بہو بنانے سے انکار کر دیا تھا اس کا جنازہ ان ہی کے گھر سے اٹھا تھا۔ ایک بار پھر سرگوشیوں میں وہی کہانی سب کی زبان پر تھی جو بزرگوں نے دبانے کچلنے کی کوشش میں مشہور کر دی تھی۔ سب احسن اور عفت کو دکھ کر چپ ہو جاتے۔ وہ دونوں مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرموں کی طرح سر جھکائے تھے۔ تصدق حسین کو اب کسی کی پروا نہیں تھی کہ کون کیا کہے گا اور کون کیا سوچتا ہے۔ وہ حسب دستور اپنے کمرے میں بند تھے۔ دادا جان نے رقیہ کے بھائیوں سے ستارہ کا

ذکر کیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اس کی ذمہ داری لینے کو تیار تھے نہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ان کے پاس نہ آ کر اور تصدق حسین کے گھر آ کر، رقیہ نے ایک بار پھر ان کی عزت مٹی میں ملا دی تھی۔

دادا جان نے سمجھایا، ستارہ کا خرچ خود اٹھانے کا یقین دلایا مگر وہ کس سے کس نہ ہوئے اور ستارہ کو دیکھے بنا، اس سے ملے بنایا واپس لوٹ گئے۔

لڑکیاں سب کمرے میں ستارہ کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ وہ دھکی دھکی اور سب دبوٹی کرنا چاہتی تھیں۔ اس کے گاؤں کا نام، اس کی تعلیم جیسی ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ اب اسے باری باری اپنے طریقے سے تسلیاں دے رہی تھیں۔ اس سے پہلے وہ سب کی باتیں سن چکی تھی جو اس بات پر متفق تھیں کہ اب دادا جان اور تایا لبا دونوں کا مستحق فیصلہ احسن اور ستارہ کی شادی ہوگا۔

اسے اس لڑکی کے لیے اپنے جذبات کچھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ بری لگ رہی تھی، بھی قابل رحم محسوس ہوتی تو بھی لگتا وہ اس کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ بلاشبہ وہ خوب صورت تھی۔ اس کی امی اور چاچی نے دیکھتے ہی کہا تھا کہ وہ ہو بہو رقیہ ہے۔

وہ کم صورت نہیں تھی لیکن اس کے مقابلے میں خود کو دیکھتی تو حسن میں اپنا آپ کتر لگ رہا تھا۔ اس عجیب و غریب صورت حال میں اب تک ستارہ نے خود کو پروقا طریقے سے سنبھالا ہوا تھا۔ تنو کے علاوہ سب کو اسے جاننے اور سننے کا بڑا اشتیاق تھا۔ دلا سے اور تسلی کے دوران انہیں پھر کچھ یاد آتا اور وہ اس سے سوال کرنے لگتیں۔ ستارہ بھی مل سے بنا کسی ناگواری اور جھنجھلاہٹ کے دھیرے دھیرے جواب دے رہی تھی۔

کچھ در دور سے اسے دیکھتے ہوئے سوچنے کے بعد وہ باہر آ گئی۔ رات کے کھانے کے بعد سب بڑے اور لڑکے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ اس کا

وہیں ہی تھے پر ایک گہرا تھا جس پر وہ سب متفق تھے کہ اب ستارہ اور احسن کی شادی ہو جائے گی جب کہ اسے اس بات کے نہ ہونے کا یقین تھا۔ وہ جانتی تھی احسن یہ بھی نہیں کرے گا لیکن اس نیک خیال کے ساتھ جو دوسری بات کا احتمال سر اٹھا رہا تھا، وہ اسے دیکھ کر رہا تھا۔ ستارہ کو رو کرنے کے لیے اب ضروری تھا کہ وہ فوراً دادا جان کے پیش کردہ ناموں میں سے کسی کو منتخب کرنے کا اعلان کر دیتا۔

ابھی گھر اور خاندان میں اس سے بڑی لڑکیاں موجود تھیں ایسے میں اس کا خیال کی کوئی آہٹ تھا، تالی ای کوئی نہیں جن پر اس نے اپنا فیصلہ چھوڑا تھا۔ اپنے خیالوں میں کوئی وہ چھت پر چلی آئی تھی۔ وہ یہ سوچتی تھی اس لیے اوپر منزل کے سب کے کمروں کی جٹیاں گل تھیں۔ عموماً لڑکیوں میں سے رات میں چھت کی طرف کوئی نہیں جاتا تھا لیکن آج اسے تہائی اور مٹی ہوا کی ضرورت تھی اور ذہن پر جو سوار تھا اس نے دوسری باتوں پر توجہ دینے کی صلاحیت چھین لی تھی۔

چھت کے اگلے حصے کی طرف جانے کے بجائے وہ دائیں طرف والی دیوار پر جا کر بیٹھ گئی جہاں مٹی میں جلی رسی تیلوں کی روئی تھیں چھت پر آسمان پر اوائل تاریکوں کا باریک سا چاند تھا مگر ستاروں کے بے شمار جھرمٹ، جا بجا ٹھہرے تھے جنہوں نے چھت کو مکمل تاریکی سے بھالیا تھا۔

نہا کی شادی اور پھر اس کے زکی ہاتھ نے انہیں معمول سے زیادہ ایک دوسرے کے مقابل کیا تھا۔ اس سے پہلے ان کا سامنا کچھ منٹوں کا ہوتا تھا اور بات چند لمحوں کی۔ اس میں بھی وہ جیتے اور جیتے ہوئے ایک دوسرے کو پڑھ لیتے تھے مگر جو کچھ ان چند لمحوں میں ہوا تھا اس نے اس خاموش تعلق میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کی ہمت کی تھی اور احسن نے وہ کیا تھا جو اس کا خاصا نہیں تھا۔ اس نے گوشت دھرنے اسپلٹ والے ہاتھ کو

دیکھا اور غائب و مانغ سے اسے کھولنے لگی۔ اس کی تکلیف پر اسپتال میں احسن کی سب سے بڑی اور فکر اسے اچھی طرح یاد تھی۔ اسپلٹ دیوار پر رکھ کے اس نے کلائی پر ہاتھ پھیرا۔ اس تکلیف وہ وقت میں احسن کا ساتھ ایسی دوا تھا کہ پھر اسے کلائی میں کوئی تکلیف محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ اچانک اس پر اداسی اور افسردگی اتنی شدت سے حملہ آور ہوئی کہ وہ رونے لگی۔ وہ کیا کرے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور دل یوں چپ چاپ ہار مان لینے کو تیار نہیں تھا۔

مستقبل میں ایسا ہوگا، یہ یقین اور ایسا ہونے کا وقت سر پر آن کھڑا ہے، اس احساس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ دل جو پہلی بات بڑی بربادی سے سوچتا تھا اس وقت جمل چل کر کسی کے حیر چکرنے کو تیار تھا۔

کچھ آہٹ ہوئی اور اس نے سر اٹھایا۔ چھت کے اگلے حصے میں کھڑا احسن اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ گڑبڑا کر دیوار سے اتر گئی۔ رقیہ کی آمد اور انتقال کے بعد سے وہ اسے اب نظر آیا تھا۔

اس کے سامنے آ کر اس نے جلتی سگریٹ پیچھنی اور اس پر اپنے سلیپر رکھ دیے۔

”اسے نکالنا نہیں ہے۔“ اس نے دیوار سے اپلٹ اٹھایا اور اس کی کلائی کے گرد لپیٹنے لگا۔

”ہر وقت پیٹ رہتا ہے اور اگر درد ہو تو رونا نہیں ہے، میڈیسن لیتی ہے۔“ وہ سر جھکائے احتیاط اور نرمی سے کام کر رہا تھا۔

اس کے آنسو دکھانا تیز ہو گئے۔ ”تو دیتے کیوں نہیں میڈیسن!“

اس نے باری باری سارے ویل کر دیکھے۔ اس کے بعد اپنی پہلی اسپلٹ پر پھیلانی اور سر اٹھایا۔ وہ جو اسے دیکھ رہی تھی دوسرے ہاتھ سے گال صاف کر کے نیچے دیکھنے لگی۔ وہ ہاتھ پکڑے اس کا ہاتھ

تھامے تھا۔

”یہ میرا لائن اتنی ہی بڑیک ہوا ہے لیکن اگر خیال

نہیں رکھا تو بڑے گا نہیں۔“ ”میں خیال رکھ تو رہی ہوں۔“ ”اس کا ہاتھ اسپلٹ پر پھیلے ہوئے ہے۔“ ”اس کا ہاتھ اسپلٹ پر پھیلے ہوئے ہے۔“

اپنی کڑی رسی۔ ”جاؤ، سو جاؤ۔ رات کافی ہو گئی ہے۔“ احسن نے کہا یہ ہی اس سے کہنا چاہتی تھی مگر چپ چاپ اپنے کی طرف پڑھتی۔

”سگریٹ بھی پیتے ہیں۔“ اس نے پہلی باز اس کے ہاتھ میں سگریٹ دیکھا تھا۔

”پارو آئی کے بعد شروع کی ہے، ان حالات میں وہ بھلا کسی سے بھی شادی کے بارے میں کہے ہو جیتے ہیں۔“ وہ خواہش کے باوجود پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔

دل چاہ تھا کہ جاؤ اور صاف صاف بات کر لو لیکن وہ بہت کہاں سے لاتی اتنی کہ دل کے کہے پر عمل کر پاتی۔

اس کے جانے کے بعد اس نے دوسری سگریٹ نکال کر جلائی اور پیچھے دیوار پر بیٹھ گیا۔

وہ ایسا بے خبر اور انجان نہ تھا کہ کلائی کے درد کو اس کے رونے کی وجہ مان لیتا، مگر وہ اس کے آنسوؤں کی وجہ ختم کرنے پر بھی قادر نہیں تھا۔ ایک عجیب سی

پہلی تھی جس کے بعد وہ کوشش بھی کرنا تو اپنی چھت کی لکیر کے آگے بڑھ نہیں پاتا تھا اور اب تو۔۔۔۔۔

☆☆☆

تعمدق حسین جس وقت ہال میں آئے وہاں دادا جان، دادو کی جان اور ان کے دونوں بھائی موجود تھے۔

”اچھا ہوا، آپ سب موجود ہیں۔“ وہ سب کو دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”ابا! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ احسن اور ستارہ کی شادی کر دی جائے۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ اس نے جتا کر چبا کر کہا تھا۔

”کیوں بیٹا۔۔۔۔۔؟“ وہ بے قرار سے اس کے

بات ہی ایسی تھی کہ فوراً کوئی کچھ نہیں بول سکا۔ ”یہ ایسی بات نہیں ہے جس کا فیصلہ تم اکیلے کرو۔“

دادی جان سب سے پہلے بولنے کے قابل ہوئیں۔

”احسن کی کہیں بات غلط نہیں ہے اور اس کی یہ عمر شادی کے لیے بالکل درست ہے۔“

”تو تمہیں خیال آ گیا بیٹے کی عمر اور شادی کا۔“ دادا جان کا لہجہ طویہ تھا۔ انہیں اس وقت بھی کس کا خیال تھا، یہ وہاں موجود سارے نفوس جانتے تھے۔

”بھائی جان! ابھی موقع نہیں ہے ان سب باتوں کا، ہم اس پر بعد میں سلی سے گفتگو کریں گے۔“ جمل حسین نے کہا۔

”ابھی موقع کیوں نہیں ہے۔۔۔۔۔ تب ہی ہال کے سامنے سے گزر رہا احسن انہیں نظر آیا۔

”احسن!“ انہوں نے اسے پکارا۔ وہاں موجود کوئی بھی بندہ اس وقت یہ ذکر چھیڑنا اور ستارہ نہیں چاہتا تھا مگر تصدق حسین کو اور کسی کی پروا ہی کب تھی۔ سب کچھ اس تیزی سے ہوا تھا کہ انہیں اسے سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے وقت چاہیے تھا اور احسن کو تو اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

وہ اندر آ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔

”ہم تمہاری اور ستارہ کی شادی کی بات کر رہے تھے۔۔۔۔۔ احسن کے اندر ابال اٹھنے لگے، اس قدر بھی اس کا خون نہیں کھولا تھا جیسا اس وقت کھولا تھا۔

”ہم۔۔۔۔۔؟“ اس نے دادا جان اور دونوں چچاؤں کو دیکھا۔

”یہ ہمارا نہیں صرف اس کا خیال ہے۔“ دادا جان نے بے رحمی سے کہا۔

”خیال کسی کا بھی ہو، اس میں برائی کوئی نہیں ہے۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ اس نے جتا کر چبا کر کہا تھا۔

”کیوں بیٹا۔۔۔۔۔؟“ وہ بے قرار سے اس کے

قریب آنے لگے تھے کہ وہ بے اختیار پیچھے ہوا، وہ بھی ٹھٹھک کر رک گئے۔ کسی سن سن لےنے والے نے مگر ہر مہر خیر بھلائی تھی اور ایک ایک کر کے سب اہل میں جمع ہونے لگے تھے۔

”آج سچہ ایسی فضول بات مجھ سے مت کیجیے گا۔“ وہ پلٹ کر جانے لگا۔

”آج سچہ! حسن! حسن!“ وہ اس کے سامنے راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ غصہ گھبرائی سی اندر آئی۔

”تم کیوں اٹھا کر رہے ہو؟“

”میں نے کہا، مجھ سے یہ بات نہ کریں۔“

اس بار اس کا لہجہ بدستور تھا۔

”لیکن کیوں؟ اس میں غلط کیا ہے؟ کسی سے تو جھگڑیں شادی کرنا ہے، ستارہ سے کیوں نہیں؟“

غصہ کو بھی اپنا شوہر اتنا سفاک نہیں لگا جتنا اس وقت محسوس ہوا تھا، بے حس اور سفاک!

”مجھ سے کیوں کا جواب نہ پوچھیں، آپ سے برداشت نہیں ہوگا۔“

”میں نے اس سے پہلے تمہاری کسی بات پر اعتراض کیا نہ کسی معاملے میں اپنی مرضی قبول کی ہے۔ آج تک باہر سے کچھ مانگا ہے بیٹا۔“

”اے!۔۔۔۔۔“ وہ سردانہ کر کے کہنے لگا۔

”آج آپ کو یاد آیا آپ کی اولاد ہے اولاد کی بات پر اعتراض نہ کرنا اور اپنی مرضی نہ قبول کرنا آپ کے نزدیک، اچھے باپ ہونے کی سند ہے تو آپ سراسر غلط ہیں۔“ اس کا ضبط ٹوٹ گیا تھا۔

بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا کوئی کمال نہیں بلکہ لاپرواہی اور اپنی ذمہ داریوں سے چشم پوشی ہے۔ جس بات کو اپنی خوبی بتا کر آپ مجھ سے اس کام کی توقع کر رہے ہیں، میرے نزدیک وہ آپ کی سب سے بڑی خالی اور غلطی ہے۔“

”حسن! مجھے تمہاری ساری باتیں قبول ہیں، میں اپنی ساری کوتاہیاں اور غلطیاں مانتا ہوں، بس تم اس سے انکار نہ کرو اس قیمتی بچی کا۔“ ایک ہل میں

وہ سب مان گئے اور احسن کو لگا وہ کچھ کر بیٹھے گا۔

”ابا!“ اس نے بہت ضبط کیا تھا پھر بھی مضر چپا نہیں سکا۔ وہ بری طرح جھنجھلا رہا تھا۔

”آپ کو اب بھی ہماری فکر نہیں ہے، میں مان جاؤں اس لیے آپ نے کہہ دیا اور یہ صرف انیسویں اور دھک کی بات نہیں، بلکہ غیرت اور شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ آپ کو اب بھی ان کی بیٹی کی فکر ہے۔“

محبت دوسروں کا احساس کرنا اور دنیا کی ساری محبتوں کی قدر سمجھنا ہے، جو محبت دوسری ساری محبتوں سے منہ موڑنا سمجھنا ہے، اپنے علاوہ باقی رشتوں کے لیے بے حس کر دے، آپ اسے کتنا بھی شاعرانہ اور مودائی نام دیں، یہ صرف خود غرضی ہے۔ محبت میں ثابت قدمی ہی ثابت کرتا ہے تو میں مان لے لیتے، دل میں جگہ نہ بھی تو زندگی میں بھی وہ جگہ خالی رکھنے کا حوصلہ کرتے لیکن جب مجبور ہو کر شادی کر لی، بچے پیدا کیے، مگر بسا پاتو پھر فرائض اور حقوق کی ادائیگی کے لیے مجبور کیوں نہیں ہوئے؟

آپ نے جہاں دل کیا، جہاں سہولت تھی وہاں مجبور ہو گئے اور باقی کمزوریوں، کوتاہیوں اور غیر ذمہ داریوں کو چھپانے کے لیے ان پر ناکام، لاعامل عشق اور بڑوں کی زیادتیوں کا پردہ ڈال دیا۔ بیوی بچوں اور گھر کی ساری آسودگیاں حاصل کر کے بھی محرومیوں کا ماتم جاری رکھا، عشق کا علم اونچا رکھا۔ تو ساری عمر وہی رہتے، شوہر اور باپ نہ بنے، مردانگی یہ ہے کہ زخمی دل اور روح کے ساتھ بھی جو ذمہ داریاں لی ہیں انہیں ہر حال نبھایا جائے مگر آپ نے۔۔۔۔۔“

”بس کرو احسن۔۔۔۔۔“ غصہ نے قریب آ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اس کی اونچی لڑائی آواز اور غصہ آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے باپ بیٹے کا لانا بچانے کی کوشش کی۔

”امی! مجھے نہ روکیں آج۔ میں سوال کا حق رکھتا ہوں، یہ مجھے دنیا میں لانے تھے تو مجھے محبت، توجہ، وقت اور جذباتی آسودگی دینے کے بھی

پابند تھے، رشتہ ان کا ہم سے تھا، حق ہمارا تھا۔

آپ نے سوال کیا نہ شکایت جو آپ دادا جان اور دادا دونوں سے کرتے کا حق رہتی ہیں۔ اس زیردستی کے رشتے میں باقاعدہ آپ کو دادا جان نے، کسی کی بیٹی کو بھونکا کر لائے تھے تو بیٹے کو اس کی من مانی کے لیے کیوں چھوڑا، ان کی ذمہ داری کیا بس شادی کر دینے تک تھی؟

وہاں شادی نہ کرنے اور آپ سے شادی کروانے والے دونوں غلط فیصلے ان کے تھے تو اس کے نتائج کی ذمہ داری قبول کر کے انہیں سلجھانے اور سنوارنے کا کام کیوں نہیں کیا۔۔۔۔۔ بہت سچ مگر کھرے سوال آپ کو ان دونوں سے سوال کرنا چاہیے، اگر آپ نہیں چاہتیں تو ٹھیک ہے لیکن میں کرنا چاہتا ہوں، مجھے کرنے دیں۔“

وہ ماں کا ہاتھ ہٹا کر پھر قصہ حق حسن کی سست دیکھنے لگا جن کے لیے آج زمین بے حشر کھلا تھا۔ دادا جان اور دادی جان دونوں کی آنکھیں مرنے لگی تھیں۔

”دراصل قربانی، برداشت اور وفا کی کہانی تو امی کی ہونی چاہیے، آپ کی نہیں آپ کو لگتا ہے حشر میں سوال محبت کے وعدوں کا ہوگا تو کیا ذمہ داریوں اور فرائض کا نہیں ہوگا؟ امی اور آپ دونوں کے معاملے میں اگر امی آپ سے باز پرس نہیں کرنا چاہتیں تو ان کے حلق میں بھی نہیں کروں گا لیکن میں آپ سے اپنی اور نعمہ کی بات ضرور کروں گا۔

آپ نے نعمہ کے رشتے پر بھی، ہاں اسی زعم میں کی تھی، خاندان اور دادا جان کو کچھ جتانے دکھانے کے لیے کہ آپ اولاد کی خوشی، اس کی پسند اور محبت کے خلاف نہیں جب کہ باپ کی حیثیت سے آپ کو پہلے اس لڑکے کے بارے میں پتا کرنا چاہیے تھا۔ وہ لڑکا نعمہ کا خواہش مند تھا اتنا کافی نہیں تھا، اس کا خاندان، وہ گھر نعمہ کے لیے مناسب ہے یا نہیں پہلے آپ کو یہ یقین کرنا چاہیے تھا، آپ نے تو نعمہ سے بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ واقعی اسے پسند

کرتی ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔ شادی اور بہتر مستقبل کے لیے بہت سی باتیں دیکھی جانی ہیں، لڑکے کی عادتیں، دوستیاں، نجیبیت، فاضل اسٹیلٹس، گھر والوں کا بیک گراؤ، معاشرے میں ان کی شہرت وغیرہ اور یہاں بھی آپ ناکام رہے تھے آپ نے کسی ایک بات پر بھی توجہ نہیں دی، کیا آپ کا یہ رویہ ذمہ دار باپ والا تھا۔۔۔۔۔“

”میں تمہارا ہر الزام قبول کرتا ہوں، اپنی کیاں کو تباہیان سب مان رہا ہوں بیٹا، سب کی غلطی کی کوشش کروں گا بس تم میری ایک التجا مان لو، اس نے کہا تھا۔ اس کی روح کو سکون اسی وقت ملے گا جب۔۔۔۔۔“

اس کا غصہ اور بڑھ گیا، وہ سب کچھ مان رہے تھے تاکہ وہ ان کی بات مان لے۔ اب بھی ان کے لیے اپنی اولاد نہیں اس کی اولاد، ہم تھی۔

”آپ دونوں محبت عشق کا دعویٰ کرنے والے، زبردستی دوسروں کے ساتھ زندگی بٹھینے والے کیسے دو افراد کو زبردستی شادی پر مجبور کر سکتے ہیں جو دادا جان نے آپ کے ساتھ کیا، وہی آپ میرے ساتھ کرنا چاہتے ہیں اور اس لڑکی کی حفاظت کیا بیوی بن کر ہی ہو سکتی ہے؟ میں اسے نعمہ کی طرح بہن سمجھ کر کسی جگہ شادی کروادوں تو۔۔۔۔۔؟ یہ حل کیوں نہیں ہو سکتا؟ یہ ٹھیک کیوں نہیں؟ کیا یہ ان خاتون کی جاتے جاتے بھی دادا جان سے اور اس خاندان سے بدلہ لینے کی کوشش نہیں ہے؟ وہ آپ سے یہ بھی تو کہہ سکتی تھیں کہ کسی اچھی جگہ اس کی شادی کروادیں، جاب لگوا دیں مالی مدد میلب کا وعدہ۔۔۔۔۔ شادی ہی کیوں؟ اور وہ بھی مجھ سے۔۔۔۔۔؟ آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن آپ اور دادا جان بلکہ سب کے نزدیک محبت، شادی اور اولاد ایک سے معنی رکھتے ہیں۔ اتنے برس بعد آپ اس وقت میرے لیے وہ ہی ہیں جو اس وقت دادا جان آپ کے لیے تھے۔“

اس نے سر جھکائے سونے پر بیٹھے دادا جان کو دیکھا۔

”فیصلے بھی میراث ہوتے ہیں اور آج میں آپ دونوں کے غلط، دوسروں کی زندگی برباد کرنے والے، کمزور، زبردستی مسلط کیے گئے، فیصلوں کی میراث سے انکار کرتا ہوں۔ میں اس لڑکی سے شادی کر کے اسے کچھ نہیں دے سکتا، نہ آپ کا اور اس کی ماں کا تعلق بھول سکتا ہوں اور نہ اس وجہ سے اہی، نعماء اور میرے حصے میں آئی محرومیاں، زخم اور درد بھول سکتا ہوں۔ جو آپ نے اہی کے ساتھ کیا، وہ میں دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ غصت کے قریب آیا۔

”اس داستان میں کوئی قابل ستائش کردار ہے تو وہ اہی ہیں، جن کے حصے میں محرومیاں، قربانیاں اور قربانیاں محبت کے بنا ہی آئیں پھر بھی انہوں نے فرار کا راستہ نہیں چنا، فرانس اور ذمہ داریوں سے منہ نہیں موڑا، ان کے پاس بھی دس بھانے اور توجہات تھیں جنہیں بنیاد بنا کر وہ بھی بہت کچھ کر سکتی تھیں ہر دن لڑائی، جھگڑوں سے لے کر بچوں سے لاپرواہی تک یا پھر وہ بھی ایک کمرہ بچہ کر دینا سے کنارہ کشی اختیار کر لیں کہ شوہر، کسی دوسری عورت کی محبت میں جلا ہے۔ یہ کد بھی لا حاصل محبت جتنا ہی، حکیم ہے، بنا فوزیہ آئی۔“ اس نے فوزیہ آنٹی کو دیکھا۔

”آپ اور آپ جیسے دوسروں نے اس داستان کو دیکھا سنا کیا ہے جو بزدلی، خود غرضی، اور غیر ذمہ داریوں اور کوتاہیوں سے بھری تھی۔ آپ نے بھی نہیں سوچا تصدق حسین اور غصت کے بیچ بھی یہ سب سنتے ہیں اور ان کے لیے یہ کہانی اذیت کا سبب ہے۔ جو جس دنیا کے سامنے شادی کر کے گھر لے جاتا ہے، اسے پرانی محبت کے سوگ میں دنیا سے کنارہ کشی کا حق نہیں ہوتا ہے، نہ خود سے اور بیوی بچوں سے لاپرواہی کی اجازت، آپ نے اس قابل خدمت، رویے کو قابل ستائش بنایا تھا۔ انہیں خاندان کے لیلی بچوں، ہیرا نمٹا بیٹے میں آپ نے کوئی کسر نہیں اٹھائی۔ اپنا یہ ذہنی فضل اور اس کے اثرات اپنی ذات تک محدود رکھنے کا حوصلہ رکھنے والوں کو ہی اس

آگ میں کودنا چاہیے اور اگر یہ حوصلہ ہو تو کسی کو اپنی ذات سے منسلک کرنے کی غلطی بھی نہیں کرنی چاہیے۔“

وہ نامی فوزیہ آنٹی پر چبھتی نظر ڈال کر دروازے تک آیا پھر پلٹا اور کافی ٹیبل پر رکھے ٹشو باکس سے کئی ٹشو سجھ کر باہر نکل گیا۔

تصدق حسین غصہ حال سے کرسی پر ڈھکے۔ ان کے علاوہ سب اپنی جگہ ساکت تھے۔

اسے باہر آتا دیکھ وہ سب تیزی سے راہداری سے غائب ہو گئی تھیں۔ وہ جو بے شکل خود کو کھیت کر اس کے باہر آنے سے پہلے دروازے کی اوٹ میں ہوتی تھی یہ سوچ کر کہ وہ ہمیشہ کی طرح بنا دیکھے اور رکے زینہ چڑھ جائے گا، اس کے رکے پر ساکت ہو گئی۔ ایسی شدید حسرت تھی کہ آنسو بھی دم سادھے تھے۔ آج اس کی نگاہوں میں تامل تھا کسی پرانے منظر کا سایہ تھا۔ اس کا بیگیا چہرہ دیکھتے ہوئے احسن نے ہاتھ سامنے کیا جس میں ٹشو تھے۔ کسی سحر کے زیر اثر اس نے ہاتھ بڑھا کر، مقدس تبرک کی طرح سارے ٹشو تمام لیے احسن نے فوراً ہاتھ نہیں ہٹایا۔

”اتنا رویا مت کرو۔“ وہ دھیمبا لہجہ اب تک سنبھالا راز عیاں ہونے کے خوف سے آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے ٹشو چھوڑ دیے جو وہ تھاے تھی۔ دوپل حریف اس نے حسرت سے بتائی تو کو دیکھا اور پھر زینہ چڑھ گیا۔ وہ اس کے جاتے ہی جیسے ہوش میں آئی۔ چہرہ صاف کرنے کے بجائے، اس نے دوسرے ہاتھ سے بھی ٹشو تھامے اور دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔

اس نے وہ ان دیکھی بیڑیاں اتار چکی تھیں جو اسے روکے تھیں۔ وہ اب جان پایا تھا، باپ کی کہانی نہیں باپ کے لیے، دل میں جھجکا تھیں اور غصہ تھا جو اسے اپنے جذبات قبول کرنے کے باوجود اظہار کرنے سے روکے تھا۔ مگر اب سب کچھ باہر اٹھارے دینے کے بعد وہ جان پایا تھا اسے مسئلہ محبت، سے تھا ہی نہیں۔

کمرے میں پہنچ کر وہ چنگ پر بیٹھ گیا۔ پہلی بار وہ بے حد پرسکون تھا۔ یہ وقت ساتھ رہنے والا بے کل سا احساس اب مفقود تھا۔ دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ غصت دستک دے کر اندر آ گئی۔

”امی!“ وہ ان کا چہرہ دیکھ کر گھبرا کر کھڑا ہوا۔ غصت کا ضبط ختم ہو گیا تھا۔ وہ بچے کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ اللہ نے انہیں محرومیوں کے بدلے جو انعام دیا تھا، اس سے زیادہ قیمتی اس دنیا میں کچھ نہ تھا۔

☆☆☆

ہال میں ہوئی باتیں سب تک پہنچ گئی تھیں۔ وہاں سب کی آوازیں بہت بلند تھیں اور باقی سارا گھر دم سادھے تھا۔ اس لیے سب نے سب سن لیا تھا، ستارہ نے بھی لیکن اس نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ شکر تھا کہ نعماء یہ سب سننے اور دیکھنے کو موجود نہیں تھی۔

”میری آج کچھ میں آیا سارے فیس پیار کرنے والے مطلب سلی جتوں پائیس اس لیے مشہور ہیں کہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔“ فریح کی بات پر رضویا نے اسے زور سے گھونسا رسید کیا۔

”کچھ بھی اول فول نہ کہو۔“

”بس ایک اور سن لو جو کب سے مجھے پریشان کر رہا ہے۔“ اس نے بازو دھلاتے ہوئے کہا۔ رضویا نے گھبرا کر روکا نہیں۔

”جو بھی احسن بھائی نے کہا ہے، اس کے بعد اگر وہ ستارہ سے شادی کر کے ساری ذمہ داریاں اور فرائض خوشی خوشی نبھائیں تو یہ تھی اچھی ایڈنگ ہوگی اس کہانی کی، نو بدلیہ، نو ذرا۔“

”انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ شادی ہی واحد حل نہیں ہے۔“ نعماء نے یاد دلایا۔

”اگر بتایا ابانے یہ ہی وعدہ کیا ہوگا تو۔۔۔؟“

”کچھ بھی ہو، احسن بھائی شادی نہیں کریں گے۔“ رضویا کو یقین تھا۔

احسن کی باتوں کے بعد سب اس کے اور غصت کے سامنے ایک نام کی چپ اوڑھے تھے۔ اس کے بعد سے تو کو احسن نظر نہیں آتا تھا۔ غصت کی چپ اسے بہت محسوس ہو رہی تھی۔ اب بھی وہ انہیں چائے دینے آئی تو وہ چوکے۔

”چائے تائی اہی۔“

”میں نے کئی تائی تاتم نے کیوں تکلیف کی۔“ انہوں نے کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ روز شام کی چائے سب کے ساتھ باہر کھن میں جتی تھیں، آج وقت کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا، بس مسکرا دی۔

”تمہارا ہاتھ کیسا ہلکا ہے۔“

”کب تک رہے گا یہ؟“ ان کا اشارہ اسپلٹ کی طرف تھا۔

”جاری رہنے کہا تھا ڈاکٹر نے، ایکس رے کے بعد طے ہوگا۔ حریف رکھنا ہے یا نہیں۔“

”اچھا۔“ انہوں نے بغور اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا۔ اس کی گھر میں سب سے زیادہ دوستی نعماء سے تھی۔ اس کے بعد وہ اداس ہو گئی تھی۔

”نعماء بے بات ہوئی تمہاری؟“ جانے وہ اسے بھلا رہی تھیں یا خود کو یا پھر وہ اس وقت سے خوف زدہ تھیں جب نعماء کو ان سب کا علم ہوگا۔

”میری کئی دن سے بات نہیں ہوئی اس سے۔“ وہ شرمندہ کی گویا ہوئی۔ اپنی انجمنوں میں وہ اسے بھی بھول بیٹھی تھی۔

”تائی اہی!“ اسی وقت رضویا دوڑتی اندر آئی۔

”وہ ہال میں۔۔۔۔۔“ اس کی کچھ میں نہیں آیا اس بات کو مناسب الفاظ میں کیے کہے، پھر بھی غصت کچھ نہیں۔ انہوں نے کپ اسے واپس تھامیا اور تیزی سے باہر نکل گئیں۔ وہ کانپتے ہاتھ میں کپ سنبھالتی

وہیں بیٹھ گئی۔

ایک بار پھر ہال میں وہی گرم بحث جاری تھی۔ تصدق حسین اپنے والد کو مرنے والی کی باتیں یاد دلادے تھے۔ انہوں نے اپنی غلطیاں تسلیم کر لی تھیں، وہ علی الاعلان اپنی عداوت کا اظہار کر چکے تھے۔ صفت اور احسن سے معافی مانگنے کا عندیہ دے چکے تھے، مگر ستارہ اور احسن کی شادی کی ضد اب بھی وہی تھی۔

”تم بھی سمجھاؤ اسے، مجھ سے ناراضی اور شکایت کا بدلہ اس بچی سے نہ لے۔“

انہوں نے صفت کو کہتے ہی ان سے کہا تھا۔ انہیں اس آدمی سے کوئی توقع نہیں تھی جو ساری عمر اپنی الہ کمالی کا آخری باب نہیں لکھ سکا تھا، جس نے اپنی کمزوریوں کو کسی تھنے کی طرح سینے پر بچایا تھا لیکن بچے کے دل کا حال، سننے کے بعد بھی اس فرمائش پر انہیں شدید غصہ آ گیا۔

”تیس احسن کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا تصدق۔“ ان کی تقریر کے بعد ایک بار پھر دادا جان نے وہی جملہ دہرایا جو وہ اس سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکے تھے۔

”اما! اس طرح پھر میں بھی مجبور ہو جاؤں گا۔“ انہوں نے گردن سیدھی کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

”کس بات کے لیے مجبور؟“ سب ہی کے اندر کوئی خدشہ سرسرایا تھا مگر سوال دادی جان نے کیا۔ ”احسن کے سامنے ایک ایسی شرط رکھنے پر مجبور جس کے بعد وہ انکار نہ کر سکے۔“

اب تک یہ باتیں اس طرح کھلے عام نہیں ہوتی تھیں بلکہ یہ قصہ پردوں میں، سرگوشیوں میں دہرایا جاتا تھا اور بڑوں نے تو کبھی اس موضوع کو چھیڑا ہی نہیں تھا۔ مگر اب یہ سب ایسے محل کرکھڑا تھا کہ ساری جگہ اور احرام تم ہو گیا تھا۔ وہ ساری عمر باپ کے سامنے خاموش رہے تھے، اس وقت بھی ان کے منہ سے کھڑے ہو کر اپنا مدعا رکھنے کی ہمت نہیں ہوئی

تھی۔ جب رقیہ کی کہیں اور شادی ہو رہی تھی لیکن اب وہ ڈٹ گئے تھے۔

”میں آپ کا بیٹا ہوں لیکن میرے اندر آپ کی کوئی خوبی، خامی اور عادت نہیں ہے، کہاں چپ رہتا ہے کہاں اپنی بات منوانا ہے میں جانتا ہوں۔“ اس نے اصرار آتے ہوئے کہا۔ وہ دروازے پر ان کا ہاتھ سن چکا تھا۔

”آپ کیا مجھے عاق کرنے کی دھمکی دیں گے؟ تو سنیں کوئی جائیداد نہیں بتائی ہے آپ نے اب تک دادا جان کے مکان میں رہ رہے ہیں اور دادی جان کی زندگی میں دادا جان ہی اپنی جائیداد کے مالک ہیں۔ مجھے آپ سے کچھ چاہیے بھی نہیں مجھے گھر سے نکالیں گے۔ نکال دیں امی کو چھوڑ دیں گے۔ کل وہ خود گھر سے کہہ چکیں، اگر میں چاہتا ہوں تو وہ یہ گھر اور سب کچھ جس میں آپ بھی شامل ہیں چھوڑ کر میرے ساتھ الگ ہو جائیں گی۔“ تصدق حسین نے بے یقینی سے صفت کو دیکھا جو انہیں نہیں اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔

”دادی جان رونے لگی تھیں۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ باپ بیٹا ایک دوسرے کے سامنے تھے اتنا کچھ تھان کے پوتے کے دل میں، وہ تو یہی سمجھتی رہی تھیں کہ انہوں نے اپنی گھر سستی کام پائی سے سنبھالی ہے۔ وہ مشکل وقت گزر چکا ہے ان کے بچے سب خوش حال اور آسودہ ہیں لیکن یہ سب تو مجرم ثابت ہوا تھا، وہ وقت کہیں گیا ہی نہیں تھا، ان کے گھر میں تیس سالوں سے ٹھہرا ہوا تھا۔ جب کہ دادا جان کو اب ماضی کی وہ بات بڑی معمولی لگ رہی تھی۔ کیا تھا جو وہ تصدق اور رقیہ کو الگ نہ کرتے، ان کی شادی کر دیجے۔ بچے ایک دوسرے کو پسند ہی تو کرتے تھے۔ مگر وقت گزر گیا تھا۔ مگر اب وہ درست فیصلہ کر چکے تھے۔

”تصدق! تم شادی کی ضد چھوڑ دو، اس بچی کی مکمل ذمہ داری ہم اٹھائیں گے مگر احسن کی شادی اس کی مرضی اور پسند سے ہوگی۔“ دادا جان جھکے سے

تھے، ایک دم ان کے کندھے بہت جھکے محسوس ہو رہے تھے۔ ”نہیں! بابا!“ تصدق حسین اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔ بیس سال پہلے جوانا اور ضد باپ نے یہ تھا ہی تھی، اس وقت وہی انا اور ضدان کے اندر سائی تھی۔ ”احسن کی شادی ستارہ سے ہی ہوگی چاہے اس کے لیے۔“

”مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔“ ستارہ کی آواز پر سب ہلے۔ وہ دائیں طرف والے دروازے سے اصرار آتی تھی جو عمو کوئی استعمال نہیں کرتا تھا۔

”اماں کو اتنی مہلت نہ ملی ورنہ میں ہی انہیں اس فضول تجویز سے روک دیتی۔“ وہ ان سب کے پاس آ کر روک گئی۔ سب کی آنکھیں اسی پر پڑ گئیں۔

”اماں نے مجھ سے پہلے کسی زندگی گزار لی، مجھے نہیں پتا لیکن انہوں نے مجھے محبت سے پالا میری چھوٹی بڑی ہر خواہش کا خیال رکھا، حالاں کہ یہ کرنا ان کے لیے آسان نہیں تھا۔ ان کے ساتھ جو ہوا اس نے انہیں رخ اور بدل کر دیا تھا، وہ آئیڈیل ماں نہیں تھیں لیکن وہ کم از کم ایک ذمہ دار ماں ضرور تھیں۔ وہ کم بات کرتی تھیں، اپنے آپ میں کم رہتی تھیں لیکن کبھی مجھ سے غافل نہیں ہوئیں مجھے لاوارث نہیں چھوڑا تھا انہوں نے۔“

کسی کو سنائی دی یا نہیں لیکن تصدق حسین کو چاہک کی آواز ہی نہیں تکلیف بھی محسوس ہوئی تھی۔ ”وہ بہت خوددار تھیں یا بہت زیادہ زخمی اور دھمی یا اتنا پرست کہ غربت اور برے حالات میں بھی، انہوں کو مدد کے لیے نکارنا ان کی طرف دیکھا، لیکن آخر میں میری ٹھہری تھی، جو وہ اس طرح آپ لوگوں کو بلک میل کرنے آئی تھیں، وہ کسی سے بدلہ نہیں لینا چاہتی تھیں۔“ اس نے ذرا گھوم کر احسن کو دیکھا۔

”یہ موت کو قریب دیکھنے والے بے یقینی انسان کا جھپٹا تھا ایک تلی پانے کی سی بنا کہ ابھی دنیا میں وہ بے سکون نہ داخل ہوں، یہ ان کی آخری کوشش اور امید تھی اور انکل۔“ وہ تصدق حسین کی سمت مڑی۔

”انہیں آپ کی بات کا یقین آ گیا تھا کہ آپ میری حفاظت کریں گے، میرا خیال رکھیں گے۔ میری لیے اور ان کے سکون کے لیے اتنا کافی ہے۔ آپ کو اس سے زیادہ کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں، زور اور جبر سے تو بالکل نہیں، جو دنیا سے جا چکا اسے خوش کرنے کے لیے جیتے جاگتے انسانوں کو نظر انداز کیسے کیا جا سکتا ہے۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو جھلنے لگے تھے۔

”میں اپنی زندگی کے فیصلوں کا اختیار دوسروں کو نہیں سونپنا چاہتی، مجھے کس سے شادی کرنی ہے۔ کس سے نہیں۔ یہ فیصلہ میرا ہوگا۔ مجھے دوسری رقیہ نہیں بننا، جس کی زندگی کے غلط فیصلے دوسرے کریں اور وہ آواز بھی نہ اٹھائے، مجبوری اور شرم و حیا کے نام پر سر جھکا کر، عمر بھر کا درد گلے لگالے، قصور سے بڑھ کر سزا پر افسوس نہ کرے، دادا لکھی۔“ وہ دادا جان کے پاس آئی۔ تنہا اور ضو یا کی طرح اس نے انہیں دادا ہی کہا۔

”آپ میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اتنا کریں کہ مجھے، اپنے ماموں سے اماں کا حصہ دلوا دیں جو نانا کی جائیداد میں ان کا شریک حق ہے اور مجھے آگے بڑھنا ہے اس معاملے میں میری رہنمائی کریں۔“ ”اس معاملے میں آپ کو جو بھی مدد چاہیے، میں حاضر ہوں۔“ دادا جان کے بجائے احسن نے جواب دیا۔

ان دونوں نے ماضی کے غلط فیصلوں کی میراث آگے بڑھانے سے انکار کرتے ہوئے، اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے اور صحیح وقت پر درست فیصلوں کو اپنی میراث بنایا تھا۔

”شکریہ“ اس کے لہجے میں ستائش ہی تھی۔ وہ تصدق حسین کی طرف مڑی۔ ”یہ آپ کا امتحان نہیں تھا اس وقت اماں کے پیش نظر صرف میرا تحفظ اور مستقبل تھا، اس کا یقین حاصل کرنے کے لیے انہوں نے وہ سب کہا ہوگا۔ آپ اسے اپنی آزمائش نہ سمجھیں، مجھے اپنی ماں کا غلط فیصلہ محسوس نہیں ہے۔“ تصدق حسین کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

”تم نے دانش مندان فیصلہ کیا ہے۔“ دادا جان نے کہا۔ ان کی آواز میں ٹھنکی تھی۔

”جب تک یہ سارے معاملات طے نہیں ہوتے، تم یہیں رہو گی۔ اس کے بعد تم جیسا کہو، ویسا انتظام کر دیا جائے گا۔“

”بہت شکریہ دادا جی۔“ اس نے ماں کے ایک بھرم کے لیے اپنا دل صاف کر لیا تھا۔

”جاؤ، آرام کرو۔“ دادی جان نے کہا۔ وہ خاموشی سے راہداری والے دروازے سے باہر نکل گئی۔ ہال میں ایک بار پھر سناٹا تھا۔ کئی لمبے گز رگھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ تصدق حسین جانے لگے تھے کہ عفت کی آواز ابھری۔

”مجھے کچھ کہنا ہے۔“ وہ رک کر انہیں دیکھنے لگے مگر عفت دادا جان سے مخاطب تھیں۔ انہوں نے سر کی جنبش سے کہا۔ ”کہو۔“

”احسن نے مجھ پر چھوڑا تھا اور مجھے احسن کے لیے خوب پسند ہے۔“ ان کی بات پر احسن سمیت سب حیران ہوئے تھے۔

”وہ تو چھوٹی ہے، اس سے پہلے۔“ وہ پر سوچ سے رک گئے پھر احسن کو دیکھا۔

”تم کیا کہتے ہو؟“

”میری بھی یہی مرضی ہے۔“ اس نے سوچ کر لفظ چنے تھے۔

”جی ٹھیک ہے، جو امی کی مرضی، جیسا امی چاہیں۔“ مجھے کوئی اعتراض نہیں، جیسا آپ مناسب سمجھیں، وغیرہ وغیرہ کی جواب تھے لیکن اسے اپنا جواب دینا تھا۔ وہ اس بات پر شرمندہ نہیں تھا، وہ باپ کی کہانی کی وجہ سے اپنی کہانی لکھنے اور عام کرنے پر تادم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

محبت میں سب کا حوصلہ اور ظرف ایک سا نہیں ہوتا۔ اسے برتنے کا انداز اس نے طے کرتا ہے۔ وہ اب جان پایا تھا کہ باپ کے روئے نے اسے محبت سے ختم نہیں کیا تھا بلکہ وہ باپ کے ظرف سے شرمندہ تھا، جس کی محبت کو تاہ اور محدود کی ایک

فحص کے آگے ان کی نظر اندھ تھی۔ لیکن یہاں احسن غلط تھا۔ یہ صرف محبت گھونے کا دکھ نہیں تھا۔ یہ رقیہ کی برباد زندگی کا غم تھا۔ جس طرح رقیہ کو تھکا کر دیا گیا۔ اس نے ہر رشتے سے ہر محبت سے محروم کر دیا تھا۔ اس نے ناکردہ جرم کی پاداش میں عمر قید کا دل اس کا ذمہ دار وہ خود کو سمجھتے تھے۔ اس بچے کو اس نے انہیں بھی پورے دل سے خوش نہ ہونے دیا۔ اگر رقیہ کے ساتھ ایسا ظلم نہ ہوتا، وہ خوش ہوتی تو شاید وہ بھی ایسی زندگی نہ گزارتے۔

احسن نے اس جذبے سے بچا ضروری چاہا تھا مگر کیا تھا۔ وہ اگر اپنی محبت کا اظہار اور اعتراف نہ کرتا تو وہ بھی مہربان کی طرح بزدل اور بھانے بازی کہلاتا۔

عفت نے اس کے لیے تھو کو چنا تھا اور یہ فیصلہ یونہی نہیں تھا۔ ان کی زندگی کا مرکز، بخور سب ان کے پیچھے تھے تو پھر ان سے یہ بھی کیسے رہتا۔ وہ محبت گزیہ تھیں مگر بھی انہوں نے بیٹے کے لیے اس کا انتخاب کیا تھا تو وہ کیوں اپنی محبت چھپاتا۔

☆☆☆

ضویانے آ کر تھو سے کہا تو وہ ہوتی ہی اس کی صورت دیکھتی رہی۔

”اسے بھی شاک لگا ہے یہ سن کر۔“ اس نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

”احسن بھائی کی شادی تم سے ہو رہی ہے ناں امی اور انہیں دونوں کو تم پسند ہو۔“ اس نے ذرا اونچی آواز میں کہتے ہوئے شانوں سے پکڑ کر اسے ہلایا۔

اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ رونے لگی۔

”اے لو! وہ فکر مندی پیچھے ہو۔“

”اب تم انکار کر کے نیا ڈرامہ نہ شروع کر دیتا۔“

”کیا، کیا ہو گیا ہے یہاں، کوئی بتائے گا مجھے؟“ بیک لیے دروازے میں کھڑی تھا حد درجہ سنجیدہ تھی۔ وہ صبح ہی صبح سے لونی تھی اور فون پر مار یہ سب سنا کر اسے الجھا کے رکھ دیا تھا۔ وہ پہلی

فرمت میں ادھر بھاگی آئی تھی۔

”خوشخبریاری بھابی بننے والی ہے۔“ اس کے پیچھے آتی فضا نے کہا۔

”بائی امی اور احسن بھائی نے اعلان پر دستخط کر دیے ہیں۔“

وہ بیک دروازے میں ہی چھوڑ کر اس کے پاس دوڑی۔

”تو بائیں تم روکس لیے رہی ہو۔“ اس نے ہنستے ہوئے تھو کو گلے لگایا۔

بائی کیا کچھ ہو چکا تھا اسے اب پروا نہیں تھی۔ بھائی نے خود کو ڈاکو کر لیا تھا اس کے لیے یہی اہم تھا۔

☆☆☆

ستارہ کے ماموں اسے کچھ بھی دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جب احسن نے انہیں قانونی کارروائی کی دھمکی دی، تب جا کر وہ بڑی مشکلوں سے راضی ہوئے تھے۔

اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا اور وہیں ہاسٹل میں رہنے لگی تھی۔ سب سے پہلے فون پر آئی

نے اس سے ملنا ملنا شروع کیا تھا، پھر ان کے ساتھ وہ سب بھی جانے آنے جانے لگی تھیں۔ سب کے ساتھ اس کی ٹھیک ٹھاک دوستی بھی میز تھو کے لیکن نعمت اب تک بھی اس سے بات نہیں کرتی تھی۔ جب بھی

خواس سے اس موضوع پر بات کرتی وہ کہتی۔ ”مجھے کچھ اور وقت چاہیے۔“ البتہ احسن کے تعلقات اس کے ساتھ عام سے اور اچھے تھے۔

تصدیق حسین کا وہی معمول تھا۔ اب وہ دلانا بھی چاہتے، بچوں اور بھوی کے قریب آنے کی کوشش بھی کرتے تو قافلے اور سرد مہر کی بہت زیادہ تھی۔ سب کو ان کی غیر موجودگی کی عادت ہو گئی تھی، ایسے میں اپنے

وجود کا احساس دلانا آسان نہیں تھا۔

عفت کی زندگی کا وہ سنہرا ادب کا گزر چکا تھا جب انہیں شوہر کی رفاقت اور محبت کی جاہت تھی۔ اب انہیں اپنے بچوں کے علاوہ کسی کی فکر تھی نہ ضرورت، انہیں اب ساتھ بھی صرف اولاد کا چاہیے تھا۔

☆☆☆

”وہ روز دس دس بار اوپر نیچے نہیں کر سکتی۔“ نعمت اور ضویا اسے کم اور اس کے لپٹے کو زیادہ تھا اسے بیڑھیوں سے احسن کے کمرے میں لے جا رہی تھیں۔

”صبح ایک بار نیچے آؤ تو پھر رات سونے کے لیے ہی جایا کرنا، باقی کام کے لیے لٹو باقی ہیں ناں۔“ نعمت نے پورے داستان کی فحاش کے ساتھ مشورہ پیش کیا۔

”تو تم ان ڈاکو کیسکی یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم اب اوپر ہی رہنا پسند کرو گی اور.....“ اس کے جواب سے پہلے ضویا، کڑے انداز میں پوچھنے لگی تھی کہ اس کے درمیان میں ہی روک دیا۔

”نہیں، بہنو! اس نے صلہ جوا عزا پتایا۔“

”نعمت سسرال چلی گئی ہے، میں بھی ادھر چاری ہو گی ہوں تو ہمارا کمرہ خالی ہو گیا ہے اگر ہم اس کمرے۔“

”خیر دار! وہ اب بھی میرا کمرہ ہے، میں سیکے آؤں گی تو کہاں جاؤں گی پھر؟“ نعمت کے اندر

اچانک تندہ والی چمک نمودار ہوئی۔

”یہاں۔“ وہ احسن کے کمرے کے سامنے پہنچ چکی تھیں۔ تھو نے آنکھوں سے دروازے کی سمت اشارہ کیا۔

”جھپٹیں ابھی چھو کھٹے ہوئے ہیں میری بھابی جیے اور سازشیں شروع کر دیں تم نے۔“ اسے صدمہ لاحق ہوا۔

تب ہی نیچے بیڑھیوں پر آٹھ ہوئی، ان تینوں نے ایک ساتھ گردن موڑی۔ وہاں احسن کھڑا اوپر دیکھ رہا تھا۔

”انف! امی کو ذرا صبر نہیں، بھابی سے زیادہ انہیں جلدی پڑی ہے۔“ نعمت بوڑھی ہوئی اسے دہیں چھوڑ کر واپس ترے کے پاس آئی۔

”یہاں سے آپ ہی اندر لے جائیں اسے بھابی! اور ابھی سے سمجھا دیں، میں اپنا کمرہ کسی کو نہیں دوں گی، اسے ہی دس دس بار اوپر نیچے کرنا پڑے گا۔“ اس نے پلٹ کر ضویا کا ہاتھ تھا اور گھبراہٹ

بوکھلائی تھو کو آنکھ مارتے ہوئے دھڑ دھڑ نیچے اتر گئی۔

ان دونوں کی دلی دلی ہنسی دور ہوتے ہوئے
معدوم ہوئی تب وہ اوپر آیا۔ وہ عین دروازے کے
سامنے کھڑی تھی، ایک طرف ہو گئی۔ احسن نے معطر
اور گل پوش کمرے کا دروازہ کھولا۔

”آؤ۔“ اسے ساتھ لے جانے کے بجائے وہ
اس کے استقبال کے لیے پہلے اندر چلا گیا اور پھر اس
کے سامنے تھکی پھلائی۔ وہ جربزی کچھ بل یونی
کھڑی رہی پھر دائیں مسمیٰ میں قید پلو چھوڑ کر ہاتھ
اٹھایا۔ وہ اس کی کھلی پھلی پر اپنا ہاتھ رکھتی اس سے
پہلے ہی، احسن نے پیش قدمی کرتے ہوئے بڑھ کر
خود ہی تمام کمرے اندر لیا۔

”تمہیں میرا یہ روم پسند نہیں؟“ پہلا سوال اور
بات ہی خلاف امدی۔

”نہیں تو۔“ وہ جو پہلے ہی حد درجہ
گھبرائی تھی، اس انوکھی بات پر اور بوکھلا گئی۔
”پھر کیوں نیچے جانا ہے تمہیں؟“ وہ ٹھہرا تو
اسے بھی رکنا پڑا۔

”وہ ایسے ہی..... میں تو تمہارا کونج کر رہی
تھی۔“ اس نے رکتے ہوئے دھبے سے کہا۔
”اب بار بار آنا جانا ہوگا تو کیا تمہیں پھر کرنے
اور فریچر کا ڈر ہے؟“ وہ اسے دیکھ نہیں رہی مگر اس
کی نگاہوں اور آواز کی ہلکی سی شوخی، چہرے کا نیم
سب اس تک پہنچ رہا تھا۔

”میری ہڈیاں اتنی کمزور نہیں ہیں۔“
”اس معاملے میں میرا دل بہت کمزور ہے۔“
”کوئی سوچ بھی نہیں سکا کہ آپ ایسے قلمی
ڈائلاگز بھی بول سکتے ہیں۔“ اس نے براٹھا کر کہا۔
ابتدائی گھبراہٹ ختم ہو گئی تھی۔ ہلکی سی جھجک تھی۔
”یہ ڈائلاگ نہیں سچ ہے، جتنے اس فریچر پر تم
نے آنسو بہائے تھے۔“

”وہ آنسو فریچر کے لیے نہیں تھے، یہ آپ بھی
جاتے ہیں۔“

”وہ سب میری وجہ سے تھے۔“
”نہیں..... ایسا تو نہیں کہا میں نے۔“

”وہ تم کبھی نہیں کہو گی۔“ اس نے اس کا ہاتھ
ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لیا۔

”لیکن سچ یہ ہی ہے۔ میں نے تمہیں بہت دانا
ہے ویسے تم اب بدلے لے لے سکتی ہو۔“
”آپ اور رو میں..... ناممکن ہے۔“

”میں نے آنسو نہیں بہائے مگر اس کا مطلب
یہ نہیں ہے کہ رویا نہیں ہوں، میں تمہارے لیے بھی
رویہا ہوں نہینت۔“

مرد کہاں اتنی آسانی سے یہ اعتراف کرتا ہے مگر
جسب اور جسب سے کروے، وہ لمحہ اس کی زندگی میں
اس شخص کے نصیب کا اعلان ہوتا ہے، عزیز از جاں،
رگ جاں، متاع جاں یا اس سے بڑھ کر۔

”آپ باتیں ایسی کر رہے ہیں کہ میں پھر
رونے لگوں گی۔“ اس نے مسرت سے لہریز دل اور
پانتوں سے بھری آنکھیں مشکل سے سنبھالیں۔

”سوری، میں نے یہ ریٹلا کر کہنے میں بہت
وقت گنوا یا کہ تمہیں دور کر کے، میں تمہارے علاوہ کسی
اور کو زندگی میں شامل نہیں کر سکتا۔“ آج تو کی خوشی
ناپے والا کوئی پتا نہ نہیں تھا۔

”آپ ایسا کرتے ہی تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوتی۔“
”تم نے خود کو کچھ زیادہ ہی اور اسٹیٹ کر لیا
تھا۔“ وہ دیر سے سے ہنسا۔

”جس رفتار سے گریہ زاری جاری تھی، سیلاب
آ جاتا تھا۔“

”چھوڑیں اب کیا بحث کرنا، آپ نے میرا
حوصلہ دیکھنے کا موقع تو گنوا دیا ہے۔“ اس نے ناک
چڑھا کر کہا۔

”اور مجھے اپنی اس نا اہلی پر فخر ہے۔“ دایاں
ہاتھ اس کے ہاتھ سمیت سینے پر رکھ کر وہ ذرا سا جھکا۔
وہ ہنس پڑی۔

قرطاس زمانہ پر داستان محبت کا ایک نیا باب
رقم ہو رہا تھا، ایک ایسا باب جس کے کردار باقی
داستانوں سے ذرا سے مختلف تھے۔

☆☆

PARHLO PAKISTAN

اب آپ ہر قسم کے ناول ہماری ویب سائٹ
سے مفت حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہماری ویب سائٹ ناولز رہٹرز کے لئے آفر
بھی دیتی ہے۔ اگر آپ لکھنے کے شائق ہیں تو ہم سے رابطہ
کریں۔ آپ کے ناولز کے علاوہ ناول کے بہترین ہونے
پر آپ کو کیش پرائز بھی دیں گے

ابھی اپنا ناول EMAIL کریں اور اپنے لکھاری ہونے کا فائدہ اٹھائیں۔

WHATSAPP GROUP : 0318-9992829

PARHLO.COM.PK@GMAIL.COM